٣

٢٣ اعتراضات سیریز

نزولِ مسیح

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

(محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے کی روشنی میں لکھا گیا)

تالیف

سید منظور الحسن

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

نزولِ مسیح

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

نزولِ مسیح

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

(محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے کی روشنی میں لکھا گیا)

تالیف

سید منظور الحسن

(معاونت: شاہد محمود)

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

طبع دوم: جولائی 2025ء

قیمت: 1500 روپے

ISBN : 979-8-9886271-5-9

Address: 3620 N Josey Ln, Suite 230 Carrollton, TX 75007

Website: www.ghamidi.org

Email: info@ghamidi.org

فہرست

دیباچہ 9

تعارف 11

باب اول: نزولِ مسیح — قرآن و حدیث کے نصوص 15

قرآن کے نصوص 17

1۔ سورۂ آلِ عمران کی آیات 54–55 17

2۔ سورۂ نساء کی آیات 157–158 19

3۔ سورۂ مائدہ کی آیات 116–117 22

حدیث کے نصوص 25

شام میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگ 25

قسطنطنیہ کی فتح 26

دجال کا ظہور 26

دجال کی شخصیت 27

دجال کے اقدام 27

دجال کا زمین پر قیام 28

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول 28

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت 28

نماز کی امامت 29

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دجال سے جنگ	29
دجال کے یہودی لشکریوں کا خاتمہ	30
فتح کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقدامات	30
یاجوج وماجوج کا خروج اور خاتمہ	30
زمین کی برکتوں کا ظہور	31
اسلام کے سوا تمام مذاہب کا خاتمہ	31
زمین پر امن اور سلامتی کا قیام	32
موذی جانوروں کی فطرت میں تبدیلی	32
مال و دولت کی کثرت	32
عبادت کی فضیلت	33
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکمرانی	33
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات	33
مسلمانوں کی روح قبض کرنے والی ہوا	33
قیامت کا صور	33
اہل دوزخ کا انتخاب	34
باب دوم: نزولِ مسیح ـــــ علما کا موقف	57
رفع مسیح کے دلائل	59
1۔ سورۂ آلِ عمران (3) کی آیات 54–55 سے استدلال	59
2۔ سورۂ نساء (4) کی آیات 156-159	74
نزولِ مسیح کے دلائل	81
1۔ نزولِ مسیح کے تصور کی اساس: احادیث	82

2۔ نزولِ مسیح کی روایات میں تواتر 83

3۔ سورۂ زخرف (43) کی آیت 61 84

تصورِ نزولِ مسیح کے متعلقات 87

1۔ نزولِ مسیح کا عقائد میں شمول 88

2۔ نزولِ مسیح کے تصور پر امت کا اجماع 90

3۔ نزولِ مسیح اور ختم نبوت 91

باب سوم: نزولِ مسیح — غامدی صاحب کے اشکالات 96

قرآن اور نزولِ مسیح: غامدی صاحب کے اشکالات 99

پہلا اشکال: قرآن میں بیان کے مواقع کے باوجود نزولِ مسیح کا عدم ذکر 100

دوسرا اشکال: قیامت کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور حضرت مسیح کا مکالمہ 112

تیسرا اشکال: حضرت مسیح کے مکمل لائحۂ عمل کا اعلان اور نزول کا عدم ذکر 117

احادیث اور نزولِ مسیح: غامدی صاحب کے اشکالات 120

پہلا اشکال: حدیث کی اولین کتاب میں نزولِ مسیح کی روایت شامل نہیں 122

دوسرا اشکال: اولین مجموعۂ حدیث میں نزولِ مسیح کی کوئی روایت شامل نہیں 127

تیسرا اشکال: امام بخاری نے نزولِ مسیح کی چند روایتیں ہی قبول کی ہیں 133

چوتھا اشکال: مسلم کی روایت میں نزولِ مسیح کے وقت کا تعین 136

پانچواں اشکال: ایک روایت کے دو طرق میں نزولِ مسیح کے ذکر کا فرق 152

چھٹا اشکال: قربِ قیامت کی علامات کی بعض روایات میں نزولِ مسیح کا عدم ذکر 158

ساتواں اشکال: نزولِ مسیح کی روایتوں اور دیگر روایتوں میں بعض تضادات 165

باب چہارم: نزولِ مسیح — غامدی صاحب کا موقف 167

1۔ نزولِ مسیح کے باب کی روایت 170

2۔ نزولِ مسیح کا رؤیا میں بیان 179
3۔ نبیوں کے رؤیا 183
4۔ تمثیلی مشاہدات کی تعبیر 186
5۔ نزولِ مسیح کی تمثیل کا مصداق 191
6۔ نزولِ مسیح کی تمثیل کی تفہیم و تشریح 196
7۔ 'نزولِ مسیح' بہ معنی 'نزولِ ہدایتِ مسیح' 204
باب پنجم: غامدی صاحب کے موقف پر سوالات 208
1۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ' سے مراد 210
'توفی' کے معنی 211
'توفی' کی قبض روح کے معنی میں قرآن سے مثالیں 218
'توفی' کی قبض روح کے معنی میں حدیث سے مثالیں 234
'توفی' کا نیند کے لیے استعمال 239
2۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ': مولانا اصلاحی کی تفسیر 244
3۔ 'وَرَافِعُکَ اِلَیَّ' کا مفہوم 259
4۔ 'قَبْلَ مَوْتِہٖ' سے مراد 262
5۔ 'وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ' کا مصداق 281
6۔ کیا نزولِ مسیح کا تصور ایمانیات میں شامل ہے؟ 286
خلاصۂ مباحث 291
ضمیمہ 307

دیباچہ

”نزولِ مسیح“ کے زیرِ عنوان یہ تحریر استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے موقف کا بیان ہے۔ اِسے اُن کی ویڈیو سیریز ”غامدی صاحب کے فکر پر 23 اعتراضات کے جواب میں“ کی اقساط 27 تا 33 سے اخذ کیا گیا ہے۔ اِس سیریز میں روایتی مذہبی فکر کے وہ اعتراضات زیرِ بحث ہیں، جو غامدی صاحب کے افکار پر بالعموم کیے گئے ہیں اور جنھیں علما کی اجماعی آرا کے مقابل میں اُن کے تفردات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت قرآن و سنت اور حدیث و سیرت کے مختلف مباحث کی رائج تعبیرات ہیں۔ غامدی صاحب نے اِنھیں قرآن و سنت کے نصوص اور حدیث و سیرت کے حقائق کے خلاف قرار دے کر جزواً یا کلیتاً قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

اِس سلسلۂ مباحث میں سوال و جواب اور بحث و مکالمے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شریکِ گفتگو محمد حسن الیاس صاحب ہیں۔ اُنھوں نے تمام بحثوں کو بالاستیعاب ترتیب دے کر نہایت خوش اسلوبی سے استاذِ گرامی کے سامنے پیش کیا ہے۔ استاذِ گرامی نے جوابی گفتگو میں روایتی نقطۂ نظر کی تشریح کی ہے، اُس کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے اور اُس کے مقابل میں اپنے موقف کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

راقم اِس سلسلۂ مباحث کو مقالات کی صورت میں تالیف کر رہا ہے۔ اِس کے لیے تفصیلی بحثیں اجزا میں تقسیم کی ہیں اور اشارات کی وضاحت اور اجمالی نکات کی تفصیل کی ہے۔

حسبِ موقع استاذِ گرامی کی تصانیف سے متعلقہ اقتباس نقل کیے ہیں۔ تشریح و توضیح اور تائید و تاکید کے لیے جلیل القدر اہل علم کی کتابوں کے حوالے بھی درج ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جو موضوعات آڈیو ویڈیو کی صورت میں دستیاب ہیں، وہ تحریری شکل میں بھی سامنے آ جائیں تاکہ طلبہ اور محققین کے لیے اُن سے استفادہ آسان ہو جائے۔ تحقیقی معاونت کے لیے شاہد محمود صاحب کی خدمات مختص ہیں۔ وہ یہ کام نہایت ذمہ داری سے انجام دے رہے ہیں۔ ترتیب و تدوین کے کام میں اُن کے ساتھ معظم صفدر صاحب اور شاہد رضا صاحب بھی شامل ہیں۔

یہ مقالات استاذِ گرامی کے افکار کے بارے میں راقم کے فہم کا بیان ہیں، تاہم خوش نصیبی ہے کہ یہ اُن کی نظر ثانی سے بھی گزر رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں فہم و بیان کے نمایاں تسامحات کی اصلاح ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔

دینی موضوعات پر استاذِ گرامی کے اعلیٰ علمی مباحث کو اُنھی کے مکالمات سے اخذ کر کے تحریر کرنا اور اِس مقصد کے لیے اُن کی اصولی رہنمائی کا میسر ہونا شرف و امتیاز کا باعث ہے۔ یہ پروردگار کی عظیم عنایت ہے، جو راقم کی اہلیت اور بساط سے یقیناً بہت بڑھ کر ہے۔ الحمدللہ۔

مذکورہ ویڈیو سیریز کی تشکیل اور اُس پر مبنی اِس سلسلۂ مقالات کی تالیف کا کام ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ“ کے زیرِ اہتمام جاری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارے اور افراد کی اِس اجتماعی کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

اکتوبر 2023ء

—— **منظور**

تعارف

"نزولِ مسیح" کا تصور اپنی تفصیل کے لحاظ سے چار تصورات کا مجموعہ ہے۔ اُن میں سے ایک رفع مسیح ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو اپنی تحویل میں لے کر آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ اِس تصور کے لیے قرآنِ مجید کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ بنائے استدلال سورۂ آلِ عمران (3) کی آیت 55 کے الفاظ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ' (میں تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا) ہیں۔ اِن میں 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو زندہ حالت میں اٹھایا تھا۔ اِس سے پہلے 'مُتَوَفِّیْكَ' کے الفاظ کو موت کے بجائے "پورا لے لینے" کے معنی پر محمول کیا گیا ہے۔

دوسرا تصور حیاتِ مسیح کا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام رفع الی اللہ سے تا حال آسمان پر زندہ و سلامت موجود ہیں۔ اِس کے لیے آلِ عمران کی مذکورہ آیت کے ساتھ سورۂ نساء (4) کی آیات 157 تا 159 کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اِن کے الفاظ 'وَ مَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًۢا، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ' (اِنھوں نے ہر گز اُس کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا) سے آلِ عمران کی آیت کو موکد کیا جاتا اور عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ موجود ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ بعض اہل علم آیت 159 کے الفاظ 'وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ' (اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا، جو اُس کی موت سے پہلے اُس پر ایمان نہ لے آئے گا) سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی، بلکہ وہ اللہ کے پاس زندہ موجود ہیں۔ اِس ضمن میں 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ' اور 'قَبْلَ مَوْتِهٖ'، دونوں میں ضمیرِ مفعول کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا جاتا ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اُن پر لازماً ایمان لائے گا۔

تیسرا تصور نزولِ مسیح کا ہے۔ یہ احادیث پر مبنی ہے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے براہِ راست زمین پر نازل ہوں گے۔ وہ فرشتوں کی رفاقت میں دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر اتریں گے۔ اُس وقت دجال نے دنیا میں فتنہ وفساد برپا کر رکھا ہو گا اور اُس سے نجات کے لیے مسلمانوں کا لشکر تیار کھڑا ہو گا۔ وہ مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کریں گے اور دجال اور اُس کے یہودی لشکریوں کو قتل کریں گے۔ اِس کے بعد یاجوج وماجوج کا خروج ہو گا۔ مسیح علیہ السلام کی دعا سے وہ بھی فنا ہو جائیں گے۔ دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی اور کرۂ ارض پر اسلام کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہے گا۔

چوتھا تصور وفاتِ مسیح کا ہے۔ اِس کے مطابق مسیح علیہ السلام اپنے نزول کے کم و بیش چالیس سال بعد وفات پا جائیں گے۔ مسلمان آپ کے جسم مبارک کو دفنا دیں گے۔ اِس کے بعد جلد ہی قیامت کا وقت آجائے گا اور دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ وفاتِ مسیح کا یہ تصور بھی احادیث سے ماخوذ ہے۔

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی رفع مسیح کے واقعے کو تسلیم کرتے ہیں، البتہ وہ مسیح علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے کو قرآنِ مجید کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' (میں تجھے وفات دوں گا) کے الفاظ آپ کی وفات کے مفہوم میں صریح ہیں، اِس مقام پر اِنھیں موت کے علاوہ کسی اور معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' کے الفاظ کا اطلاق وہ آپ کے جسدِ اطہر پر کرتے ہیں۔ اِس کا مقصد اُسے یہود کی بے حرمتی سے محفوظ رکھنا تھا۔

چنانچہ اُن کے نزدیک اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وفات دی اور اُس کے بعد آپ کے وجود کو اپنی طرف اٹھالیا۔ جہاں تک نزولِ مسیح کے تصور کا تعلق ہے تو اُسے وہ محل نظر سمجھتے ہیں۔ اِس کا سبب وہ اشکالات ہیں، جو نزولِ مسیح کی احادیث کو قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھنے اور اُن کی جملہ روایتوں کو تدبرِ حدیث کے اصولوں پر جانچنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اشکالات مانع ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی پر یقین کیا جائے۔

زیرِ نظر تصنیف استاذِ گرامی کے اِسی موقف کا بیان ہے۔

یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے: ”نزولِ مسیح ——قرآن و حدیث کے نصوص“۔ اِس میں بہ طورِ تمہید اُن آیات اور احادیث کو درج کیا ہے، جن سے مسیح علیہ السلام کے رفع و نزول اور حیات و وفات کے تصورات کو اخذ کیا جاتا ہے۔ اِس کا مقصد بحث کی اساسات کو سامنے لانا ہے۔ دوسرے باب میں علما کی آرا نقل کی گئی ہیں۔ اِن کا ذکر اُس پس منظر کو نمایاں کرنے کے لیے ہے، جس میں استاذِ گرامی نے اپنا موقف پیش کیا ہے۔ تیسرا باب استاذِ گرامی کے اُن اشکالات کا بیان ہے، جو عقل و نقل پر مبنی ہیں اور نزولِ مسیح کے تصور کو قبول کرنے میں مانع ہیں۔ یہ اشکالات قرآنِ مجید اور کتبِ احادیث، دونوں کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔ چوتھا باب استاذِ گرامی کے موقف کا بیان ہے۔ اِس میں زیرِ بحث نصوص پر اُن کے نقطۂ نظر کی تفصیل کی ہے اور اُس کے استدلال کو بیان کیا ہے۔ پانچویں باب کی نوعیت تقابلی مطالعے کی ہے۔ اِس میں علما کے دلائل کا جائزہ لیا ہے اور استاذِ گرامی کے موقف کے تقابل میں اُن کے اسقام کو واضح کیا ہے۔

آخری حصہ ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ اِس میں اُن علما کی آرا کو نقل کیا ہے، جو نزولِ مسیح کے قائل نہیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ قارئین اگر مزید تنقیح یا تقابلی مطالعے کے خواہش مند ہوں تو اُنھیں ضروری رہنمائی فراہم ہو جائے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

باب اول

نزولِ مسیح — قرآن و حدیث کے نصوص

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر تھے۔ وہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کم و بیش پانچ سو سال پہلے مبعوث ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز کیا تھا۔ چنانچہ اُن کی بعثت کا مقصد بنی اسرائیل پر اللہ کی حجت تمام کرنا تھا۔ اِس اتمامِ حجت کے لیے اللہ نے اُنھیں بعث و نشر کی مجسم اور مشہود نشانی بنایا تھا۔ وہ جس طرح دنیا میں آئے، جس طرح رہے اور جس طرح رخصت ہوئے، وہ سب خارقِ عادت مظاہر اور نادرِ روزگار واقعات کا مجموعہ ہے۔ قرآن نے اُنھیں ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' سے موسوم کیا ہے[1] اور 'اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ' — دنیا والوں کے لیے نشانی — قرار

---

[1] ''یعنی خدا کا کلمۂ 'کن' اور اُس کی طرف سے ایک روح تھے، جو اُسی طرح پھونکی گئی، جس طرح آدم و حوا میں پھونکی گئی تھی۔'' (البیان 1/ 582)

استاذِ گرامی نے اِس کی شرح میں لکھا ہے:

''اصل الفاظ ہیں: 'اَرِنَا مَنَاسِكَنَا'۔ اِن میں 'اَرِنَا' کے معنی 'ہمیں دکھا' کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم نے یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا ہے کہ عبادات سے متعلق جو سنن انبیا علیہم السلام نے قائم کی ہیں، اُن کی تعلیم بالعموم اِس طرح دی گئی کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے

دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

... اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ.... (النساء4:171)

”... حقیقت یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابنِ مریم اللہ کا ایک رسول اور اُس کا ایک قول ہی تھا، جو اُس نے مریم کی طرف القا فرمایا تھا اور اُس کی جانب سے ایک روح تھا (جو اللہ نے اُس میں پھونک دی تھی)...۔“

...وَجَعَلۡنٰهَا وَابۡنَهَاۤ اٰيَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ. (الانبیاء21:91)

”...ہم نے اُس خاتون کو اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔“

امتِ مسلمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع و نزول اور حیات و وفات کے تصورات رائج ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے آپ کو مصلوب کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو اپنی تحویل میں لے کر آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ وہ آسمان پر زندہ و سلامت موجود ہیں۔ قیامت کے قریب آسمان سے براہِ راست زمین پر نازل ہوں گے اور کچھ متعین امور انجام دے کر وفات پا جائیں گے۔ اِن تصورات کے لیے قرآن و حدیث کے جن نصوص سے استدلال کیا جاتا ہے، وہ آیندہ صفحات میں درج ہیں۔

حکم سے اُن پر عمل کر کے رؤیا وغیرہ میں اُنھیں دکھا دیا۔“ (البیان 1/ 130)

قرآن کے نصوص

قرآنِ مجید نے اپنے مخاطب سرزمین عرب کے اہل کتاب کی رعایت سے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں مختلف توضیحات کی ہیں۔ اِن کا مقصد اُن کے باطل دعووں اور جھوٹے نظریات کی تردید ہے۔ اِنھی میں سے ایک معاملہ آپ علیہ السلام کی وفات اور رفع الی اللہ کا بھی ہے۔ اِس کا ذکر تین مقامات پر ہوا ہے۔

1۔ سورۂ آل عمران کی آیات 54-55

ایک مقام سورۂ آل عمران (3) کی آیات 54 تا 55 پر مشتمل ہے۔ اِس میں سلسلۂ کلام آیت 33 سے شروع ہوتا ہے۔ ابتداءً فرمایا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کو اُن کی انفرادی حیثیت میں اور ذریتِ ابراہیم — بنی اسرائیل و بنی اسمٰعیل — کو بہ حیثیتِ جماعت نبوت و رسالت اور شہادت علی الناس کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ. ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۢ بَعۡضٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ. (3: 33-34)

”اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اُن کی رہنمائی کے لیے) منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں

اور (جو کچھ کہتے اور کرتے رہے ہیں،
اللہ اُس سے واقف ہے، اِس لیے کہ)
اللہ سمیع و علیم ہے۔"

یہاں آلِ عمران، یعنی عمران کے خاندان کا ذکر اُس کلام کی تمہید ہے، جو اُس کے چشم و چراغ سیدنا مسیح علیہ السلام کے حوالے سے آگے آنے والا ہے۔ اِس تمہید کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدۂ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے۔ بتایا ہے کہ سیدہ مریم کی ماں نے اُنھیں حمل کے دوران ہی میں اللہ کی نذر کر دیا تھا۔ پھر جب وہ دنیا میں آئیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کو اُن کی کفالت اور تربیت کی ذمہ داری پر مقرر فرمایا۔ اُن کی سرپرستی میں وہ بیت المقدس میں داخل ہوئیں اور اللہ کی عبادت میں شب و روز مشغول ہو گئیں۔ اللہ نے اُنھیں دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ چنانچہ اُنھیں حضرت مسیح کی بشارت دی اور بتایا کہ اُن کا فرزند گہوارے ہی میں اپنی نبوت کا اعلان کرے گا۔ اِس کے بعد بیان ہوا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اُنھیں اللہ کی طرف سے ودیعت کی گئی نشانیوں سے آگاہ فرمایا کہ وہ اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے کو بینا کرتے ہیں، لاعلاج کوڑھی کو اچھا کرتے ہیں اور مُردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل نے آپ کی دعوت کا انکار کیا تو آپ نے 'مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ' کی صدا بلند کی اور آپ کے حواریوں نے 'نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ' کا جواب دیا۔

یہ وہ تناظر اور سیاق و سباق ہے، جس میں آیات 54-55 وارد ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف خفیہ تدبیریں شروع کیں تاکہ آپ کو کسی جرم کے بہانے مصلوب کیا جا سکے۔[2] اللہ نے فرمایا کہ اُس کی تدبیروں کے مقابلے میں

---

[2] سورۂ نساء (4) کی آیت 157 سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت مسیح کو صلیب دے کر قتل کرنا چاہا، مگر اللہ کے حکم سے وہ ایسا نہیں کر سکے۔

ایسی تدبیروں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی تدبیر سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ. اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.

”اور بنی اسرائیل نے (اُس کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں، اور اللہ نے بھی (اِس کے جواب میں) خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا، جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

2۔ سورۂ نساء کی آیات 157-158

دوسرا مقام سورۂ نساء (4) کی آیات 157 تا 158 ہیں۔ یہ سورۂ نساء کے اختتامی اجزا میں سے ہے۔ اِس میں سلسلۂ کلام کا آغاز آیت 153 سے ہوتا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ 'يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ

السَّمَآءِ'، ''اہل کتاب تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم اُن پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار دو۔'' اِس پر آپ کو آگاہ فرمایا ہے کہ اُن کے ایسے مطالبات باعثِ تعجب نہیں ہیں، یہ پہلے بھی ایسے تقاضے کرتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو اِنھوں نے اِس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ کا مشاہدہ کراؤ۔ اللہ نے اِس کا جواب ایسے دیا تھا کہ اِنھیں آسمانی کڑک نے دبوچ لیا تھا۔ اِس سلسلۂ کلام میں آگے بنی اسرائیل کے بدترین جرائم گنوائے ہیں اور پھر بتایا ہے کہ اِن کی وجہ سے اللہ نے اِن کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اِنھی جرائم میں سے یہ جرم بھی ہیں کہ اِنھوں نے سیدہ مریم علیہا السلام پر بہتان طرازی کی اور پھر اُن کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اُس پر مستزاد یہ جھوٹا دعویٰ کیا کہ وہ اِس گھناؤنی حرکت میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اِس سازش میں ناکام رہے تھے اور اللہ نے اِنھیں شبہے میں مبتلا کر کے حضرت مسیح کو اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ ارشاد فرمایا ہے:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا. وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا. فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ	''یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجاے) اِن پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ ـــــ سو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اِنھوں نے موسیٰ سے اِس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ اِنھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں خدا کو سامنے دکھاؤ تو اِن کی اِس سرکشی کے باعث اِن کو کڑک نے آلیا تھا۔ پھر اِنھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اِس کے بعد کہ اِن کے پاس کھلی کھلی

كُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ
بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّ قَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ
طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا
يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا . وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ
عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا . وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا
قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ
رَسُوۡلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَ
لٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا
فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ
عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡهُ
يَقِيۡنًا . بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا . (4:153-158)

نشانیاں آچکی تھیں۔ اِس پر بھی ہم نے اِس سے در گذر کیا اور موسیٰ کو (اِن پر) صریح غلبہ عطا فرمایا تھا۔ اور ہم نے طور کو اِن پر اٹھالیا تھا، اِن سے عہد کے ساتھ اور اِن کو حکم دیا تھا کہ (شہر کے) دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہوں اور اِن سے کہا تھا کہ سبت کے معاملے میں نافرمانی نہ کرنا اور (اِن سب چیزوں پر) ہم نے اِن سے پختہ عہد لیا تھا۔ پھر اِن کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے (ہم نے اِن پر لعنت کر دی)، اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے اللہ کی آیتوں کو نہیں مانا اور اِن کے نبیوں کو ناحق قتل کر دینے کی وجہ سے اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف ہیں — نہیں، بلکہ اِن کے کفر کی پاداش میں اللہ نے اِن کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اِس لیے (اب) یہ کم ہی ایمان لائیں گے —۔ اور اِن کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بہتانِ عظیم لگانے کی وجہ سے۔ اور اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابنِ مریم، رسول اللہ کو قتل

کر دیا ہے —— دراں حالیکہ اِنھوں نے
نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب
دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا
دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر
رہے ہیں، وہ اِس معاملے میں شک میں
پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے
متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں
کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے
ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ ہی
نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا اور اللہ
زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔"

3۔ سورۂ مائدہ کی آیات 116-117

تیسرا مقام سورۂ مائدہ (5) کی آیات 116 تا 117 ہیں۔ یہاں قیامت کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہونے والی گفتگو نقل ہوئی ہے۔ گویا یہ مستقبل میں رونما ہونے والا ایک واقعہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان فرما دیا ہے۔

اِس میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اُن کے متبعین —— نصاریٰ —— کے سامنے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اِن لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اللہ کے سوا آپ کو اور آپ کی والدہ کو معبود بنا لیں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب میں کہیں گے کہ میرے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ میں لوگوں سے ایسی بات کہوں، جس کا مجھے حق حاصل نہیں ہے! اگر میں نے اِس طرح کی بات کہی ہوتی یا میرے دل میں ایسی کوئی بات ہوتی تو آپ اِس سے ضرور آگاہ ہوتے۔ میں نے تو اِن سے بس وہی کچھ کہا تھا، جس کا آپ نے حکم ارشاد

فرمایا تھا۔ پھر وہ کہیں گے کہ میں جب تک اِن کے اندر موجود رہا، اِن کی نگرانی کرتا رہا۔ اُس کے بعد آپ نے مجھے وفات دے دی اور میں اِن کی نگرانی پر مامور نہیں رہا۔ چنانچہ وفات کے بعد سے آج یوم قیامت تک آپ ہی اِن کے نگران رہے ہیں، لہٰذا آپ ہی بہتر جانتے ہیں۔

اِن آیات میں 'فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ' (پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں) کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام وفات (اور رفع الی اللہ) کے بعد قیامت تک اپنے متبعین کے معاملات سے بے خبر تھے۔

آیات درج ذیل ہیں:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ.

"(اللہ کی گواہی جن لوگوں نے چھپائی ہے، وہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب یہ باتیں ہوں گی) اور یہ بھی کہ جب (اِنھیں یاد دلا کر) اللہ پوچھے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا تم مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ وہ عرض کرے گا: سبحان اللہ، یہ کس طرح روا تھا کہ میں وہ بات کہوں، جس کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ کے علم میں ہوتی، (اِس لیے کہ) آپ جانتے ہیں، جو کچھ میرے دل میں ہے اور آپ کے دل کی باتیں میں نہیں جانتا۔ تمام چھپی ہوئی باتوں کے جاننے والے تو

آپ ہی ہیں۔ میں نے تو اُن سے وہی بات کہی تھی، جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ میں اُن پر نگران رہا، جب تک میں اُن کے درمیان تھا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں۔“

یہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات اور آپ کے رفع الی اللہ کے بارے میں قرآنِ مجید کے ارشادات ہیں۔ اِن میں سے سورۂ آل عمران میں وفات اور رفع، دونوں کا بیان ہے۔ سورۂ نساء میں صرف رفع، جب کہ سورۂ مائدہ میں صرف وفات کا ذکر آیا ہے۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو پہلے وفات دی اور پھر اپنی طرف اٹھالیا۔

حدیث کے نصوص

نزولِ مسیح کے موضوع پر قریباً چالیس روایتیں ہیں، جو صحاح ستہ اور اُن سے قبل و بعد کے کم و بیش تمام مجموعوں میں نقل ہوئی ہیں۔ اِن میں صحیح، حسن اور ضعیف، تینوں درجوں کی روایتیں شامل ہیں۔ اِن کے مجموعی مفہوم سے جو تفصیلات سامنے آتی ہیں، وہ نکات کی صورت میں درجِ ذیل ہیں۔

شام میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگ

* قیامت سے پہلے شام کی سرزمین پر جنگ کا ایک واقعہ رونما ہو گا۔

* شام کی مسلمان حکومت عیسائیوں کے کچھ لوگوں کو قید کر لے گی۔ اِس کے جواب میں عیسائیوں کا لشکر شام پر حملے کے لیے روانہ ہو گا اور بڑھتے بڑھتے شام کے اندر ''اعماق'' یا ''دابق'' کے مقام تک پہنچ جائے گا۔

* مدینہ منورہ کی مسلمان حکومت کو اِس حملے کی خبر ہو گی تو وہ اہل شام کی مدد کے لیے اپنا لشکر روانہ کرے گی۔ یہ لشکر نہایت صالح مسلمانوں پر مشتمل ہو گا۔

* جب یہ لشکر عیسائی فوج کے مقابل صف آرا ہو گا تو عیسائی لشکر کی طرف سے اُسے کہا جائے گا کہ وہ اُن کے معاملے میں مداخلت نہ کریں اور ایک طرف ہو جائیں۔

* مدینہ کے مسلمانوں کا لشکر پیچھے ہٹنے سے انکار کر دے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے بھائیوں کو تمھارے مقابلے میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔

* اِس کے بعد جنگ شروع ہو جائے گی۔

* جنگ شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی فوج کا ایک تہائی حصہ فرار ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑا جرم ہو گا، جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائیں گے۔

* مسلمانوں کی فوج کا ایک تہائی حصہ شہید ہو جائے گا۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک افضل الشہدا ہوں گے۔

* باقی ماندہ ایک تہائی مسلمان فوج عیسائیوں پر فتح حاصل کر لے گی۔

قسطنطنیہ کی فتح

* شام کی جنگ میں فتح حاصل کرنے والے مسلمانوں کا لشکر مدینہ واپس جانے کے بجائے عیسائیوں کے مرکز قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

* وہاں پہنچ کر جنگ ہو گی اور قسطنطنیہ فتح ہو کر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ جائے گا۔

* فتح حاصل کرنے کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم ہو گی۔

* مسلمان فوج کے سپاہی مطمئن اور بے خوف ہو کر اپنی تلواریں زیتون کے درختوں سے لٹکا دیں گے۔

دجال کا ظہور

* اِسی اثنا میں شیطان اعلان کرے گا کہ شام میں اُن کے اہل و عیال کے پاس مسیح دجال پہنچ چکا ہے۔

* یہ سن کر مسلمانوں کا لشکر قسطنطنیہ سے واپس روانہ ہو گا۔

دجال کی شخصیت

* المسیح الدجال نوجوان ہو گا۔اُس کی رنگت گندمی ہو گی۔اُس کے بال گھنگریالے ہوں گے۔
* وہ ایک آنکھ سے اندھا ہو گا۔
* دونوں آنکھوں پر دبیز گوشت چڑھا ہو گا۔
* اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہو گا۔
* وہ زمانۂ جاہلیت کے ایک شخص عبد العزیٰ بن قطن [3] سے مشابہ ہو گا۔
* وہ ہوا کی رفتار سے چلے گا۔

دجال کے اقدام

* وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش برسنے لگے گی۔
* وہ زمین کو درخت اگانے کا حکم دے گا تو وہ درخت اگائے گی۔
* وہ زمین کو حکم دے گا کہ اپنے خزانے نکال دے تو وہ نکال دے گی۔
* اُس کے حکم سے مویشی اپنی چراگاہوں سے اِس طرح لوٹیں گے کہ اُن کے کوہان لمبے، کولہے چوڑے اور پھیلے ہوئے اور تھن دودھ سے بھرے ہوں گے۔
* وہ ایک شخص کے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے قتل کر دے گا، پھر اُسے آواز دے گا تو وہ زندہ ہو کر ہنستا ہوا اُس کے پاس آجائے گا۔
* لوگ اُس کے کارنامے دیکھ کر اُس کی دعوت قبول کر لیں گے۔
* پہلے عام عورتیں اور لونڈیاں اُس کی اتباع کریں گی۔

---

[3] عبد العزیٰ بن قطن بن عمرو الخزاعی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ بنت خویلد کا بیٹا۔اِس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔

* وہ رب ہونے کا دعویٰ بھی کرے گا۔

* وہ مدینہ میں داخل ہونا چاہے گا، مگر داخل نہ ہو سکے گا۔

دجال کا زمین پر قیام

* وہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور چالیس دن، چالیس ماہ یا چالیس سال تک دنیا میں موجود رہے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول

* قسطنطنیہ سے واپس شام پہنچ کر جب مسلمانوں کا لشکر نمازِ فجر کے لیے صفیں باندھ لے گا تو اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا۔

* آپ آسمان سے براہِ راست نازل ہوں گے اور دمشق شہر کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے پاس اتریں گے یا بعض روایتوں کے مطابق مدینۂ منورہ کے قریب روحا کے مقام پر اتریں گے۔

* اترتے ہوئے آپ دو فرشتوں کے پروں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت

* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قد درمیانہ ہو گا۔ چہرے کا رنگ سرخ و سفید ہو گا۔

* سر کے بال خشک ہونے کے باوجود ایسے محسوس ہوں گے، جیسے بھیگے ہوئے ہیں اور پانی کے قطرے اُن سے ٹپکنے لگے ہیں۔ آپ سر جھکائیں گے تو اُس سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور سر اٹھائیں گے تو سفید چاندی کے دانے جھڑیں گے۔

* ظاہری شکل و صورت میں وہ عروہ بن مسعود[4] سے مشابہ ہوں گے۔

---

[4] معروف صحابی عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ۔ قریش کی معتبر شخصیت تھے۔ نہایت خوب صورت

* آپ زرد رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہوں گے۔

نماز کی امامت

* مسلمانوں کا امیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امامت کے لیے درخواست کرے گا۔
* آپ فرمائیں گے کہ مسلمانوں کا امام ہی نماز پڑھائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہو گا۔
* بعض روایتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز کی امامت فرمائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دجال سے جنگ

* پھر عیسیٰ علیہ السلام دجال سے جنگ کے لیے نکلیں گے۔
* دجال جیسے ہی آپ کو دیکھے گا، وہ تحلیل ہونے لگے گا، اُسی طرح جیسے نمک پانی میں تحلیل ہوتا ہے۔ گویا صورت یہ ہو گی کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیں تو وہ خود ہی گھل کر ختم ہو جائے۔
* مگر عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے اُسے خود قتل کرنے کا فیصلہ کریں گے۔
* اِس مقصد کے لیے وہ اُسے لد[5] کے مشرقی دروازے پر لے کر جائیں گے اور اَفیق[6] کی گھاٹی کے قریب نیزہ مار کر ہلاک کر دیں گے۔

اور وجیہ تھے۔

5 لُدّ (Lydd) فلسطین کا ایک شہر ہے، جو اسرائیلی دار الحکومت تل ابیب کے قریب واقع ہے۔

6 افیق شام کا ایک شہر ہے، جو اسرائیل کی سرحد پر واقع ہے۔ اِس کے قریب طبریہ کی جھیل ہے، جس سے دریائے اردن نکلتا ہے۔ اِس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے۔ اِس راستے کو عقبۂ افیق، یعنی افیق کی گھاٹی کہا جاتا ہے۔

* قتل کے بعد آپ لوگوں کو اپنا نیزہ دکھائیں گے، جس پر دجال کا خون لگا ہو گا۔

دجال کے یہودی لشکریوں کا خاتمہ

* دجال کا لشکر ستر ہزار یہودیوں پر مشتمل ہو گا۔
* اُس کے قتل کے بعد یہودی چھپنا چاہیں گے، مگر اُنھیں کوئی ٹھکانا نہیں ملے گا۔
* وہ درختوں اور پتھروں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کریں گے۔ مگر درخت اور پتھر بول کر بتادیں گے کہ اے روح اللہ، دیکھیے، یہودی یہاں موجود ہیں۔
* عیسیٰ علیہ السلام کی سانس کی ہوا جس یہودی تک پہنچے گی —— اور وہ اُن کی حدِ نظر تک پہنچے گی —— وہ زندہ نہ بچے گا۔
* چنانچہ لشکر کے تمام یہودی ہلاک ہو جائیں گے۔

فتح کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقدامات

* دجال پر فتح حاصل کر لینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب کو توڑیں گے۔
* خنزیر کو ہلاک کریں گے اور جنگ اور جزیہ ختم کر دیں گے۔

یاجوج وماجوج کا خروج اور خاتمہ

* دجال کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیں گے کہ وہ مسلمانوں کو طور پہاڑ کے پاس جمع کریں۔
* اِسی اثنا میں یاجوج وماجوج کا خروج ہو گا۔ وہ ہر بلندی سے پل پڑیں گے۔
* وہ بحیرۂ طبریہ (Sea of Galilee)[7] سے گزریں گے اور اُس کا سارا پانی پی جائیں گے۔

---

[7] اسرائیل میں میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل۔ اس کا رقبہ 166 مربع کلو میٹر ہے۔

* وہ بیت المقدس کے پہاڑ کے پاس پہنچ کر اہل آسمان کو قتل کرنے لیے اوپر کی طرف تیر پھینکیں گے۔ اللہ اُن تیروں کو خون آلود کر کے واپس بھیج دے گا۔

* پھر وہ عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کا محاصرہ کریں گے۔

* عیسیٰ علیہ السلام اُن سے بچاؤ کے لیے اللہ سے دعا کریں گے۔

* اللہ اُن کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا کرے گا، جس سے وہ سب یک لخت مر جائیں گے۔

* سارا علاقہ اُن کی لاشوں سے بھر جائے گا۔

* عیسیٰ علیہ السلام اِن سے نجات کے لیے دعا کریں گے تو اللہ ایسے پرندوں کو بھیجے گا، جن کی جسامت اونٹوں کی گردنوں جتنی ہوگی۔ وہ اُنھیں اٹھا کر اللہ کے حکم کے مطابق کہیں پھینک دیں گے۔

* اُن کے تیر اور ترکش اتنے زیادہ ہوں گے کہ مسلمان اُنھیں سات سال تک جلاتے رہنے کے بعد ختم کر سکیں گے۔

زمین کی برکتوں کا ظہور

* عیسیٰ علیہ السلام کی برکت سے زمین ایسے انار اگائے گی کہ ایک انار ایک جماعت کے لیے کفایت کرے گا۔ وہ اتنا بڑا ہوگا کہ لوگ اُس کے چھلکے کو سائبان بنا سکیں گے۔

* ایک اونٹنی کا دودھ ایک بڑی جماعت کے لیے، ایک گائے کا دودھ ایک قبیلے کے لیے اور ایک بکری کا دودھ ایک خاندان کے لیے کافی ہوگا۔

اسلام کے سوا تمام مذاہب کا خاتمہ

* اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب ختم ہو جائیں گے۔ زمین مسلمانوں سے اِس طرح بھر جائے گی، جس طرح برتن پانی سے بھر جاتا ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق زمین اسلام سے

اِس طرح بھر جائے گی، جس طرح کنواں پانی سے بھر جاتا ہے۔

* انسانوں کا کلمہ ایک ہو جائے گا اور زمین پر اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہو گی۔

زمین پر امن اور سلامتی کا قیام

* زمین امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ سلامتی کا دور دورہ ہو گا۔

* دنیا سے عداوت اور بغض کو اٹھالیا جائے گا۔

* ناراض لوگ صلح کر لیں گے، دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ تلواروں کی ضرورت ختم ہو جائے گی اور اُن کی درانتیاں بنالی جائیں گی۔

موذی جانوروں کی فطرت میں تبدیلی

* موذی جانور موذی نہیں رہیں گے۔ چھوٹا بچہ اژدھا کے ساتھ کھیلے گا تو وہ اُسے نقصان نہ پہنچائے گا۔

* جانور آپس میں پُر امن ہو جائیں گے۔ صورت یہ ہو گی کہ شیر، چیتے، بھیڑیے اور اونٹ، گائیں اور بکریاں، یعنی درندے اور چرندے اکٹھے چرنے چگنے لگیں گے۔

* بھیڑیا بکریوں میں کتے کی طرح اور شیر اونٹنیوں میں اُن کے نر کی طرح ہو گا۔

مال و دولت کی کثرت

* مال و دولت کی کثرت ہو جائے گی۔

* آسمان اپنا رزق اتارے گا اور زمین اپنی برکتیں باہر نکال دے گی۔

* غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حاجت مندوں کی حاجتیں ختم ہو جائیں۔ چنانچہ لوگ مال تقسیم کرنا چاہیں گے، مگر کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا۔

عبادت کی فضیلت

* عبادت کی اہمیت ہر چیز پر فائق ہو گی۔
* لوگ اللہ کے حضور میں ایک سجدے کو دنیاومافیہا سے بہتر سمجھنے لگیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکمرانی

* حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک امامِ عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے مسلمانوں پر حکومت کریں گے۔
* وہ چالیس سال تک زمین میں رہیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات

* نزول کے چالیس سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا جائیں گے۔
* مسلمان اُن کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور اُنھیں دفن کر دیں گے۔

مسلمانوں کی روح قبض کرنے والی ہوا

* شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا چلے گی۔
* یہ ہوا مسلمانوں کی بغلوں میں داخل ہو کر اُن کی روحیں قبض کر لے گی۔
* اِس کے نتیجے میں کوئی مسلمان زندہ نہیں بچے گا۔
* صرف اشرار باقی رہ جائیں گے، جن پر قیامت نازل ہو گی۔

قیامت کا صور

* اِس کے بعد پہلی بار صور پھونکا جائے گا، جسے سن کر سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔

* پھر بارش برسے گی، جس کی بوندیں انسانی نطفے جیسی ہوں گی۔
* اِس کے نتیجے میں مرے ہوئے لوگ اُگ کر زمین سے باہر آ جائیں گے۔
* پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا، جس کی آواز سے تمام انسان کھڑے ہو جائیں گے۔
* آخرِ کار سب انسانوں کو حساب کتاب کے لیے اُن کے رب کی طرف بلایا جائے گا۔

اہل دوزخ کا انتخاب

* اعمال کے حساب کتاب کے بعد تمام لوگوں میں سے اہل دوزخ کا انتخاب کیا جائے گا۔
* اِس کی نسبت یہ ہو گی کہ ہر ایک ہزار افراد میں سے نو سو ننانوے افراد دوزخ کے لیے الگ کیے جائیں گے۔

اِن نکات کی حامل نمایندہ روایتیں درجِ ذیل ہیں:

1۔ عن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذی نفسی بيده ليوشكن ان ينزل فِيكم ابن مريم حكماً عدلاً فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية و يفيض المال حتىٰ لا يقبله احد حتی تكون السجدة الواحدة خيرًا من الدنيا وما فيها.[8] (بخاری، رقم 3448)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مسلمانو)، اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، ابنِ مریم تمھارے درمیان حق و باطل کے معاملے میں انصاف کی بات کرنے والے ایک حکم بن کر لازماً اتریں گے۔ پھر وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے[9] اور

[8] یہ حدیث صحیح ہے۔

[9] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کی وضاحت کرتے ہوئے

جزیہ[10] کا خاتمہ کر دیں گے[11] اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اُسے قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور ایک سجدہ کر لینا دنیا ومافیہا سے بہتر ہو گا۔"

2۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تقوم الساعة حتى ينزل

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت

لکھتے ہیں:

" مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دین عیسوی کی پوری عمارت اِس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی، جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیا کی امتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتیٰ کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا، جو تمام انبیا کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اِسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیرووں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ اُن کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔" (تفہیم القرآن 4/155)

[10] دوسری روایت میں 'جزیہ' کے بجائے 'حرب' کا لفظ ہے، یعنی جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔

[11] یعنی ملتوں کے اختلافات ختم ہو جائیں گے اور سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ اِس کے نتیجے میں نہ جنگ ہو گی اور نہ جزیہ عائد کرنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

فيكم ابن مريم حكمًا مقسطًا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويفيض المال حتى لا يقبله أحد.[12] (بخاری، رقم 2476)

تک قائم نہ ہو گی، جب تک تم میں عیسیٰ ابنِ مریم حق و باطل کے معاملے میں انصاف کی بات کرنے والے ایک حَکم بن کر نازل نہیں ہوں گے۔ پھر وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اُسے قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔"

3۔ عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : كيف أنتم إذا نزل ابن مريم فيكم وإمامكم منكم![13]
(مسلم، رقم 155)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارا کیا معاملہ ہو گا، جب تمھارے اندر ابنِ مریم اتریں گے اور اُس وقت تمھارا امام تم میں سے ہو گا!"[14]

4۔ عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: لا تقوم الساعة حتى ينزل الروم بالاعماق أو بدابق، فيخرج إليهم جيش من المدينة، من خيار أهل الارض

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہو گی، یہاں تک کہ روم کے نصاریٰ کا لشکر اعماق میں یا دابق میں اترے گا۔

---

[12] یہ حدیث صحیح ہے۔
[13] یہ حدیث صحیح ہے۔
[14] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت نہیں کرائیں گے۔

يومئذ. فإذا تصافوا، قالت الروم: خلوا بيننا وبين الذين سبوا منا نقاتلهم، فيقول المسلمون: لا، والله، لا نخلي بينكم وبين إخواننا. فيقاتلونهم، فينهزم ثلث لا يتوب الله عليهم أبدًا، ويقتل ثلثهم، أفضل الشهداء عند الله ويفتتح الثلث، لا يفتنون أبدًا. فيفتتحون قسطنطينية، فبينما هم يقتسمون الغنائم، قد علقوا سيوفهم بالزيتون، إذ صاح فيهم الشيطان: إن المسيح قد خلفكم في أهليكم، فيخرجون، وذلك باطل. فإذا جاءوا الشأم خرج، فبينما هم يعدون للقتال، يسوون الصفوف، إذ أقيمت الصلاة، فينزل عيسى ابن مريم صلى الله عليه وسلم، فأمهم فإذا رآه عدو الله، ذاب كما يذوب الملح في الماء، فلو تركه لانذاب حتى يهلك، ولكن يقتله الله بيده، فيريهم دمه في حربته.[15] (مسلم، رقم 7460)

پھر اُس سے جنگ کے لیے مدینہ کا ایک لشکر نکلے گا، جو زمین والوں میں سب سے بہتر ہو گا۔ جب دونوں لشکر صفیں باندھ لیں گے تو رومی (مدینہ کے لشکر والوں سے) کہیں گے: تم ہمارے اور اِن لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنھوں نے ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنایا ہوا ہے تا کہ ہم اِن سے قتال کریں۔ مسلمان جواب دیں گے: نہیں، اللہ کی قسم، ہم کبھی اپنے بھائیوں سے الگ نہ ہوں گے۔ پھر جنگ ہو گی تو مسلمانوں کا ایک تہائی لشکر بھاگ نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اِن کی توبہ کبھی قبول نہ کرے گا۔ ایک تہائی لشکر مارا جائے گا۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک سب شہیدوں میں افضل ہوں گے۔ باقی ماندہ ایک تہائی لشکر کو فتح حاصل ہو گی۔ وہ عمر بھر کبھی فتنے اور آزمایش میں نہ پڑیں گے۔ پھر وہ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ اُس کے بعد جب وہ مالِ غنیمت کو بانٹ رہے ہوں

---

[15] یہ حدیث صحیح ہے۔

گے اور اپنی تلواروں کو زیتون کے
درختوں سے لٹکا چکے ہوں گے تو
اچانک شیطان اعلان کرے گا کہ مسیح
دجال تمھارے پیچھے تمھارے اہل و
عیال کے پاس پہنچ چکا ہے۔ یہ خبر سن
کر مسلمان فوراً واپس روانہ ہو جائیں
گے۔ تاہم، یہ خبر جھوٹ ہو گی۔ پھر
جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال نکل
آئے گا۔ چنانچہ جس وقت مسلمان
جنگ کے لیے تیار ہو کر نماز (فجر) کے
لیے صفیں باندھ رہے ہوں گے تو اُس
وقت عیسیٰ ابنِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم
نازل ہوں گے اور اُن کی امامت
فرمائیں گے۔ جب اللہ کا دشمن دجال
عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو وہ ایسے
تحلیل ہونا شروع ہو جائے گا، جیسے
نمک پانی میں تحلیل ہوتا ہے۔ ——
گویا عیسیٰ علیہ السلام اُس کو یونہی چھوڑ
دیں تو وہ خود بہ خود ختم ہو جائے۔——
البتہ، اللہ تعالیٰ اُس کو عیسیٰ علیہ السلام
کے ہاتھوں سے قتل کرائیں گے۔ پھر
اللہ اُنھیں دکھائے گا کہ دجال کا خون
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نیزے پر

لگا ہوا ہے۔"

5۔عن النواس بن سمعان قال: ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الدجال ذات غداة، فخفض فيه ورفع، حتى ظنناه في طائفة النخل. فلما رحنا إليه عرف ذلك فينا، فقال: ما شأنكم؟ قلنا: يا رسول الله، ذكرت الدجال غداة، فخفضت فيه ورفعت حتى ظنناه في طائفة النخل. فقال: غير الدجال أخوفني عليكم، إن يخرج وأنا فيكم، فأنا حجيجه دونكم، وإن يخرج ولست فيكم فامرؤ حجيج نفسه والله خليفتي على كل مسلم. إنه شاب قطط عينه طافئة، كأني أشبهه بعبد العزى بن قطن، فمن أدركه منكم، فليقرأ عليه فواتح سورة الكهف. إنه خارج خلة بين الشأم والعراق فعاث يمينًا وعاث شمالاً، ياعباد الله فاثبتوا. قلنا: يا رسول الله وما لبثه في الارض؟ قال: أربعون يومًا. يوم كسنة، ويوم كشهر، ويوم كجمعة، وسائر أيامه كأيامكم.

"حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا۔ اِس دوران میں آپ نے اپنی آواز پست بھی کی اور بلند بھی کی۔ اِس سے ہمیں خیال ہوا کہ وہ قریب ہی کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ بعد ازاں شام کے وقت ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ہمارے چہروں کو خوف زدہ دیکھ کر پوچھا: تمھیں کیا ہوا ہے؟ ہم نے کہا: یا رسول اللہ، جب آپ نے دجال کا ذکر فرمایا اور اپنی آواز کو پست بھی رکھا اور بلند بھی فرمایا تو اِس سے ہمیں اندیشہ ہوا کہ دجال قریب ہی کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ (یہ سن کر) آپ نے فرمایا: مجھے تمھارے بارے میں دجال سے بڑھ کر ایک اور بات کا اندیشہ ہے۔ دجال اگر میری موجودگی میں ظاہر ہوا تو میں خود اُس کے خلاف حجت پیش کروں گا۔ لیکن اگر اُس کا

قلنا: يا رسول الله، فذلك اليوم الذى كسنة، أتكفينا فيه صلاة يوم؟ قال: لا، اقدروا له قدره. قلنا: يا رسول الله، وما إسراعه فى الارض؟ قال: كالغيث استدبرته الريح. فيأتى على القوم فيدعوهم، فيؤمنون به ويستجيبون له، فيأمر السماء فتمطر والارض فتنبت فتروح عليهم سارحتهم، أطول ما كانت ذرًا، وأسبغه ضروعًا، وأمده خواصر، ثم يأتى القوم، فيدعوهم فيردون عليه قوله فينصرف عنهم، فيصبحون ممحلين ليس بأيديهم شىء من أموالهم، ويمر بالخربة، فيقول لها: أخرجى كنوزك، فتتبعه كنوزها كيعاسيب النحل. ثم يدعو رجلاً ممتلئًا شبابًا، فيضربه بالسيف فيقطعه جزلتين رمية الغرض، ثم يدعوه فيقبل ويتهلل وجهه، يضحك. فبينما هو كذلك إذ بعث الله المسيح ابن مريم، فينزل عند المنارة البيضاء شرقى دمشق بين مهرودتين واضعًا كفيه على أجنحة

ظہور میرے رخصت ہونے کے بعد ہوا تو تم میں سے ہر مسلمان اُس کے خلاف حجت پیش کرے گا۔ اللہ ہر مسلمان کا محافظ ہو گا۔ (آپ نے مزید فرمایا کہ) دجال گھنگھریالے بالوں والا جوان ہو گا۔ اُس کی ایک آنکھ اندھی ہو گی۔ وہ عبدالعزیٰ بن قطن کے مشابہ ہو گا۔ تم میں سے جو شخص اُس کو دیکھے، وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات کی تلاوت کرے۔ (پھر آپ نے فرمایا): وہ شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اللہ کے بندو، تم (اُس کے مقابلے میں) ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، اُس کا زمین میں قیام کتنی مدت کے لیے ہو گا؟ آپ نے فرمایا: چالیس دن تک۔ البتہ، اِن میں سے ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا، ایک دن ایک مہینے جتنا ہو گا، اور ایک دن ایک جمعہ، (یعنی سات دنوں) کی طرح ہو گا۔ باقی (37) دن عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ، یہ بھی بتادیجیے

ملكين، إذا طأطأ رأسه قطر، وإذا رفعه تحدر منه جمان كاللؤلؤ. فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه إلا مات، ونفسه ينتهي حيث ينتهي طرفه، فيطلبه حتى يدركه بباب لد، فيقتله. ثم يأتي عيسى ابن مريم قوم قد عصمهم الله منه، فيمسح عن وجوههم ويحدثهم بدرجاتهم في الجنة. فبينما هو كذلك إذ أوحى الله إلى عيسى: إني قد أخرجت عبادًا لي، لا يدان لاحد بقتالهم، فحرز عبادي إلى الطور. ويبعث الله يأجوج ومأجوج، وهم من كل حدب ينسلون، فيمر أوائلهم على بحيرة طبرية فيشربون ما فيها، ويمر آخرهم فيقولون: لقد كان بهذه مرة ماء! — ثم يسيرون حتى ينتهوا إلى جبل الخمر، وهو جبل بيت المقدس، فيقولون: لقد قتلنا من في الارض هلم، فلنقتل من في السماء، فيرمون بنشابهم إلى السماء، فيرد الله عليهم نشابهم مخضوبة دمًا —. ويحصر نبي الله

کہ جو دن ایک سال کے برابر ہو گا، کیا اُس ایک دن کی (پانچ) نمازیں کفایت کریں گی؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ البتہ، تم اپنے اندازے سے اُن کے اوقات مقرر کر لینا۔ پھر ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، دجال زمین میں کتنی تیزی سے چلے گا؟ آپ نے فرمایا: جس تیز رفتاری سے ہوا بادلوں کو چلاتی ہے۔ (فرمایا): وہ کچھ لوگوں کے پاس جائے گا اور اُنھیں دعوت دے گا۔ وہ اُس کی دعوت پر ایمان لائیں گے اور اُس کی تصدیق کریں گے۔ وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش ہونے لگے گی، زمین کو درخت اگانے کا حکم دے گا تو وہ درخت اگائے گی۔ شام کو اُن کے مویشی اپنی چراگاہوں سے اِس طرح لوٹیں گے کہ اُن کے کوہان لمبے، کولہے چوڑے اور پھیلے ہوئے اور تھن دودھ سے بھرے ہوں گے۔ (فرمایا): پھر وہ دوسرے لوگوں کے پاس جا کر اپنی دعوت پیش کرے گا۔ وہ اُس کی تکذیب اور تردید کریں گے۔ جب وہ وہاں سے واپس ہو گا تو

عیسى وأصحابه حتى يكون رأس الثور
لأحدهم خيرًا من مائة دينار
لأحدكم اليوم. فيرغب نبي الله
عيسى وأصحابه فيرسل الله عليهم
النغف في رقابهم، فيصبحون فرسى
كموت نفس واحدة. ثم يهبط نبي
الله عيسى وأصحابه إلى الارض، فلا
يجدون في الارض موضع شبر إلا
ملأه زهمهم ونتنهم. فيرغب نبي
الله عيسى وأصحابه إلى الله،
فيرسل الله طيرًا كأعناق البخت
فتحملهم فتطرحهم حيث شاء الله.
ثم يرسل الله مطرًا لا يكن منه بيت
مدر ولا وبر، فيغسل الارض حتى
يتركها كالزلفة. ثم يقال للارض:
أنبتي ثمرتك، وردي بركتك فيومئذ
تأكل العصابة من الرمانة، ويستظلون
بقحفها ويبارك في الرسل، حتى أن
اللقحة من الإبل لتكفي الفئام من
الناس، واللقحة من البقر لتكفي
القبيلة من الناس واللقحة من
الغنم لتكفي الفخذ من الناس.
فبينما هم كذلك إذ بعث الله ريحًا

اُن لوگوں کے اموال اُس کے ساتھ
چل پڑیں گے۔ صبح تک لوگ بالکل
خالی ہو جائیں گے۔ پھر وہ ایک ویران
زمین سے کہے گا کہ اپنے خزانے نکالو،
اور جب لوٹے گا تو زمین کے خزانے
اُس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کے
سرداروں کی طرح (بہ کثرت) چل
رہے ہوں گے۔ پھر وہ ایک نوجوان کو
بلائے گا اور تلوار سے نشانے کے عین
مطابق اُس کے دو ٹکڑے کر دے گا۔
اِس کے بعد وہ دوبارہ اُس کو بلائے گا تو
وہ کھکھلاتا اور ہنستا ہوا اُس کے پاس
آئے گا۔ اِسی دوران میں اللہ تعالیٰ
عیسیٰ ابنِ مریم کو بھیج دیں گے۔ وہ
دمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار
کے پاس نازل ہوں گے۔ وہ زرد لباس
پہنے ہوں گے اور دو فرشتوں کے
پروں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے ہوں
گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو یوں
لگے گا کہ قطرے (بالوں سے) ٹپک
رہے ہیں۔ جب سر اٹھائیں گے تو
قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے نظر آئیں
گے۔ (فرمایا): اُن کے سانس کی ہوا

طيبة، فتأخذهم تحت آباطهم، فتقبض روح كل مؤمن وكل مسلم، ويبقى شرار الناس، يتهارجون فيها تهارج الحمر، فعليهم تقوم الساعة.
(مسلم، رقم 7560)

جس کافر تک پہنچے گی ـــ اور وہ اُن کی حدِ نظر تک پہنچے گی ـــ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اُسے پکڑ لیں گے اور اُسے قتل کر دیں گے۔ اِس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں کے پاس آئیں گے، جنھیں اللہ نے دجال سے بچایا ہو گا۔ وہ اُن کے چہروں کو سہلائیں گے اور اُن کو جنت میں اُن کے درجات سے آگاہ فرمائیں گے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجیں گے کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکالے ہیں، جن سے لڑنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ آپ اِنھیں بہ حفاظت طور کی طرف لے جائیے۔ پھر اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو بھیجے گا، اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔ اِن کا پہلا گروہ بحیرۂ طبریہ پر سے گزرے گا اور اُس میں جتنا پانی ہو گا، پی لے گا۔ اِس کے بعد اُن کا دوسرا گروہ وہاں پہنچے گا تو وہ کہے گا کہ کیا اِس دریا میں کبھی پانی بھی تھا! ـــ پھر وہ آگے بڑھتے ہوئے اُس پہاڑ تک پہنچیں گے،

جہاں درختوں کی کثرت ہے، یعنی بیت المقدس کا پہاڑ۔ وہ کہیں گے کہ ہم زمین والوں کو تو قتل کر چکے ہیں۔ آؤ اب آسمان والوں کو بھی قتل کریں۔ پھر وہ اپنے تیر آسمان کی طرف چلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن تیروں کو خون میں بھر کر لوٹا دیں گے—۔[16] اور اللہ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب مشکل میں ہوں گے۔ یہاں تک کہ اُن کے نزدیک بیل کا سر سو اشرفیوں سے افضل ہو گا۔ (فرمایا): پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب دعا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج پر عذاب بھیجیں گے۔ اُن کی گردنوں میں کیڑا پیدا ہو گا، جس کی وجہ سے صبح تک وہ سب مر جائیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب زمین میں اتریں گے تو زمین میں ایک بالشت برابر جگہ خالی نہ ہو گی۔ (ہر جگہ اُن کی لاشیں پڑی ہوں گی)۔ زمین ان کی

---

[16] یہ حصہ اِس روایت میں نہیں ہے، اِسے اگلی روایت، رقم 7561 سے لیا گیا ہے۔

بدبو اور غلاظت سے بھری ہوئی ہو
گی۔ پھر اللہ کے رسول عیسٰی علیہ
السلام اور اُن کے ساتھی اللہ سے دعا
کریں گے۔ چنانچہ اللہ ایسے پرندوں کو
بھیجے گا، جو بڑے اونٹوں کی گردنوں
کے برابر ہوں گے۔ وہ اُن لاشوں کو
اٹھا لے جائیں گے اور اُنھیں وہاں
پھینک دیں گے، جہاں اللہ کا حکم ہو گا۔
پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا، جو
زمین کے ہر حصے کو دھو ڈالے گی۔
زمین ایسی صاف شفاف ہو جائے گی،
جیسے حوض ہوتا ہے۔ اِس کے بعد
زمین کو حکم ہو گا کہ اپنے پھل اگا اور
اپنی برکت کو لوٹا دے۔(اِس کے نتیجے
میں بہت بڑے بڑے پھل پیدا ہوں
گے)۔ ایک انار ایک گروہ کے لیے
کفایت کرے گا۔ اُس کا چھلکا سائبان
کے برابر ہو گا۔وہ اُس کے سایہ میں
بیٹھیں گے۔ دودھ میں اتنی برکت ہو
گی کہ ایک اونٹنی کا دودھ انسانوں کے
ایک بڑے گروہ کو کفایت کرے گا۔
ایک گائے کا دودھ ایک برادری کے
لیے اور ایک بکری کا دودھ ایک

خاندان کے لیے کافی ہو گا۔ اِسی دوران میں اللہ تعالیٰ ایک پاک ہوا بھیجیں گے، جو اُن کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور اثر کر جائے گی۔ اِس کے نتیجے میں ہر مومن اور مسلم کی روح قبض ہو جائے گی۔ برے اور بد ذات لوگ باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی طرح آپس میں لڑیں گے۔ اِن لوگوں پر قیامت قائم ہو گی۔"

6۔ عن جابر بن عبد الله، يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين إلى يوم القيامة، قال: فينزل عيسى ابن مريم صلى الله عليه وسلم، فيقول أميرهم: تعال صل لنا، فيقول: لا، إن بعضكم على بعض أمراء تكرمة الله هذه الامة.[17]

(مسلم، رقم 412)

"سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا۔ وہ قیامت کے دن تک غالب رہے گا۔ پھر عیسیٰ ابنِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آیئے اور نماز پڑھایئے۔ وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔ یہ اُس اکرام کی وجہ سے ہو گا، جو اللہ نے اِس

[17] یہ حدیث صحیح ہے۔

امت کو عطا فرمایا ہے۔"[18]

7۔ عن يعقوب بن عاصم بن عروة بن مسعود الثقفي، يقول: سمعت عبد الله بن عمرو، وجاءه رجل، فقال: ما هذا الحديث الذي تحدث به؟ تقول: إن الساعة تقوم إلى كذا وكذا، فقال: سبحان الله او لا إله إلا الله، او كلمة نحوهما لقد هممت ان لا احدث احدًا شيئًا ابدًا إنما قلت: إنكم سترون بعد قليل امرًا عظيمًا يحرق البيت ويكون ويكون. ثم قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يخرج الدجال في امتي، فيمكث اربعين لا ادري اربعين يومًا، او اربعين شهرًا او اربعين عامًا، فيبعث الله عيسى ابن مريم كانه عروة بن مسعود فيطلبه فيهلكه، ثم يمكث الناس سبع سنين ليس بين اثنين عداوة، ثم يرسل الله ريحًا باردة من قبل الشام، فلا يبقى على وجه الارض احد في قلبه مثقال ذرة من

"یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود ثقفی سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے سنا کہ اُن کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: وہ کون سی حدیث ہے، جو تم بیان کرتے ہو کہ قیامت اتنی مدت میں ہو گی؟ اُنھوں نے تعجب کا اظہار کیا اور سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ یا اِس طرح کا کوئی کلمہ کہا۔ پھر بولے: میرا ارادہ ہے کہ اب کسی سے کوئی حدیث بیان نہ کروں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم تھوڑے دنوں بعد ایک بڑا حادثہ دیکھو گے، جو گھروں کو جلا دے گا، اور وہ ہو گا، ضرور ہو گا۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دجال میری امت میں نکلے گا اور چالیس تک رہے گا۔ میں نہیں جانتا چالیس دن فرمایا یا چالیس مہینے یا چالیس برس۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کو بھیجے گا، اُن کی شکل عروہ بن مسعود کی

[18] مطلب یہ ہے کہ وہ خود امامت کرانے کے بجائے اُسی کو امامت کے لیے کہیں گے۔

خیر او إیمان، إلا قبضته حتی لو ان احدکم دخل فی کبد جبل لدخلته علیه حتی تقبضه. قال: سمعتها من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: فیبقی شرار الناس فی خفة الطیر واحلام السباع، لا یعرفون معروفًا، ولا ینکرون منکرًا. فیتمثل لهم الشیطان، فیقول: الا تستجیبون، فیقولون: فما تامرنا فیامرهم بعبادة الاوثان، وهم فی ذلك دار رزقهم حسن عیشهم. ثم ینفخ فی الصور، فلا یسمعه احد إلا اصغی لیتًا ورفع لیتًا، قال: واول من یسمعه: رجل یلوط حوض إبله، قال: فیصعق ویصعق الناس، ثم یرسل اللّٰہ، او قال: ینزل اللّٰہ مطرًا کانه الطل او الظل نعمان الشاك، فتنبت منه اجساد الناس. ثم ینفخ فیه اخری، فإذا هم قیام ینظرون. ثم یقال: یا ایها الناس هلم إلی ربکم، وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ. قال: ثم یقال اخرجوا بعث النار فیقال: من کم، فیقال: من کل الف تسع مائة وتسعة

سی ہو گی۔ وہ دجال کو ڈھونڈیں گے اور اُس کو قتل کر دیں گے۔ پھر سات برس تک لوگ ایسے رہیں گے کہ دو شخصوں میں کوئی دشمنی نہ ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا۔ اُس کے بعد زمین پر ایسا کوئی شخص نہ رہے گا، جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان یا بھلائی ہو، یہ ہوا اُس کی جان نکال لے گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی تم میں سے پہاڑ کے اندر گھس جائے تو وہاں بھی یہ ہوا پہنچ کر اُس کی جان نکال لے گی۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر برے لوگ دنیا میں رہ جائیں گے۔ اُن کے اخلاق جلد باز چڑیوں کی طرح یا احمقوں اور درندں کی طرح ہوں گے۔ نہ وہ اچھی بات کو سمجھ سکیں گے اور نہ بری بات کو۔ پھر شیطان ایک صورت میں آ کر اُن سے کہے گا: کیا تم میری بات نہیں مانتے! وہ کہیں گے: پھر تو ہمیں کیا حکم دیتا ہے؟ شیطان کہے گا: بت پرستی کرو۔ وہ بت پوجیں

وتسعین. قال: فذاك یوم —— یَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا[19] —— وذلك —— یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ.[20] (مسلم، رقم 7568)

گے اور اِس کے باوجود اُن کی روزی کشادہ ہو گی۔ وہ مزے سے زندگی بسر کریں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ جو بھی اُس کی آواز سنے گا، وہ اپنی گردن کو ایک مرتبہ ایک طرف جھکائے گا اور دوسری طرف سے اٹھا لے گا۔یعنی بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ سب سے پہلے صور کو وہ شخص سنے گا، جو اپنے اونٹوں کے حوض پر گارے سے لپائی کرتا ہو گا۔ وہ بے ہوش ہو جائے گا اور دوسرے لوگ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسا پانی برسائے گا، جو نطفہ کی طرح ہو گا۔ اُس سے لوگوں کے بدن اگ آئیں گے۔ پھر صور میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو سب لوگ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ پھر پکارا جائے گا: لوگو، اپنے مالک کے پاس آؤ اور (حکم ہو گا کہ) اِنھیں کھڑا کرو، اِن سے پوچھا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر کہا جائے گا: اِن میں سے

---

[19] المزمل 73:17۔

[20] القلم 68:42۔

دوزخ کے لیے ایک فوج نکالو۔ پوچھا جائے گا کہ وہ فوج کتنے لوگوں پر مشتمل ہو ؟ حکم ہو گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے نکالو۔[21] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی وہ دن ہے، جو ''بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔'' اور یہی وہ دن ہے، ''جب بڑی ہلچل پڑے گی۔''''

8۔ عن أبي هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس بيني وبينه نبي يعني عيسى وإنه نازل فإذا رأيتموه فاعرفوه رجل مربوع إلى الحمرة والبياض بين ممصرتين كأن رأسه يقطر وإن لم يصبه بلل فيقاتل الناس على الإسلام فيدق الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويهلك الله في زمانه الملل كلها إلا الإسلام ويهلك المسيح الدجال فيمكث في الارض أربعين سنة ثم يتوفى فيصلي عليه المسلمون.[22]

(ابوداؤد، رقم 4324)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور اُن، (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور وہ نازل ہونے والے ہیں۔ جب تم اُنھیں دیکھو تو اُنھیں پہچان لینا۔ وہ درمیانے قد کے شخص ہوں گے، اُن کے چہرے کا رنگ سرخ و سفید ہو گا۔ وہ دو زرد رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ اُن کے سر کے بال ایسے ہوں گے، جیسے اُن سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالاں کہ وہ بھیگے ہوئے نہیں ہوں گے۔ وہ اسلام کی خاطر لوگوں سے جنگ کریں گے۔ صلیب کو

---

[21] گویا ہر ایک ہزار میں سے ایک جنتی ہو گا۔

[22] یہ حدیث صحیح ہے۔

پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، اور جزیہ ختم کر دیں گے۔ اُن کے زمانے میں اللہ اسلام کے سوا تمام ملتوں کو ہلاک کر دے گا۔ وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ زمین میں چالیس سال رہیں گے۔ پھر وہ وفات پا جائیں گے اور مسلمان اُن کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔“

9۔ عن سفينة مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ألا إنه لم يكن نبي قبلي إلا قد حذر الدجال أمته، هو أعور عينه اليسرى، بعينه اليمنى ظفرة غليظة مكتوب بين عينيه: كافر، يخرج معه واديان أحدهما جنة والآخر نار، فناره جنة، وجنته نار، معه ملكان من الملائكة يشبهان نبيين من الانبياء لو شئت سميتهما بأسمائهما وأسماء آبائهما، واحد منهما عن يمينه، والآخر عن شماله، وذلك فتنة، فيقول الدجال: ألست بربكم؟ ألست أحيي وأميت؟ فيقول له أحد الملكين:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا: مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا، جس نے اپنی امت کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ اُس کی بائیں آنکھ اندھی ہو گی اور دائیں آنکھ پر ایک موٹی پھلی ہو گی۔ اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہو گا۔ اُس کے پاس جنت اور جہنم کی دو وادیاں ہوں گی۔ اُس کی جہنم جنت اور جنت جہنم ہو گی۔ اُس کے ساتھ دو فرشتے بھی ہوں گے، جو دو نبیوں کے مشابہ ہوں گے۔ میں چاہوں تو اُن نبیوں اور اُن کے آبا کا نام بھی بتا سکتا ہوں۔ اُن میں سے ایک اُس کی دائیں

كذبت. ما يسمعه أحد من الناس إلا صاحبه، فيقول له: صدقت . فيسمعه الناس فيظنون أنما يصدق الدجال وذلك فتنة، ثم يسير حتى يأتي المدينة، فلا يؤذن له فيها؟ فيقول: هذه قرية ذاك الرجل. ثم يسير حتى يأتي الشام، فيهلكه الله عند عقبة أفيق.[23]
(مسند احمد، رقم 21929)

جانب اور دوسرا بائیں جانب ہو گا۔ یہ ایک آزمایش ہو گی۔ پھر دجال کہے گا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ کیا میں زندگی اور موت نہیں دیتا؟ اُن میں سے ایک فرشتہ کہے گا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بات کوئی انسان نہ سن سکے گا۔ اُس کا ساتھی اُس سے کہے گا کہ تم نے سچ کہا۔ اُس کی آواز لوگ سن لیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ وہ دجال کی تصدیق کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک آزمایش ہو گی۔ پھر وہ روانہ ہو گا، یہاں تک کہ مدینہ جا پہنچے گا۔ لیکن اُسے داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔ وہ کہے گا کہ یہ اُس آدمی کا شہر ہے۔ پھر وہ وہاں سے چل کر شام پہنچے گا اور اللہ تعالیٰ اُسے افیق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔“

10۔ عن أبي هريرة رضى الله عنه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تقوم الساعة حتى ينزل فيكم ابن مريم حكمًا مقسطًا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی، جب تک تم میں عیسیٰ ابنِ مریم حق و باطل کے معاملے

[23] یہ حدیث حسن ہے۔

ويفيض المال حتى لا يقبله أحد .[24] (بخاری، رقم 2344)

میں انصاف کی بات کرنے والے ایک حکم بن کر نازل نہیں ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے اور جزیہ کو ختم کر دیں گے اور مال کی وہ کثرت ہو گی کہ اُسے قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔"

11۔ عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه و سلم قال: كيف أنتم إذا نزل ابن مريم فيكم وإمامكم منكم؟[25] (مسلم، رقم 155)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: تمھارا کیا معاملہ ہو گا، جب تمھارے اندر ابنِ مریم اتریں گے اور تمھارا امام تم میں سے ہو گا؟"[26]

12۔عن حذيفة بن أسيد الغفاري، قال: اطلع النبي صلى الله عليه وسلم علينا ونحن نتذاكر، فقال: ما تذاكرون؟ قالوا: نذكر الساعة، قال: إنها لن تقوم حتى ترون قبلها عشر آيات فذكر الدخان، والدجال، والدابة، وطلوع الشمس من مغربها، ونزول عيسى ابن مريم صلى الله عليه وسلم،

"حذیفہ بن اسید الغفاری بیان کرتے ہیں کہ ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ نے پوچھا: کیا باتیں کر رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: وہ ہرگز قائم نہ ہو گی، جب تک اُس سے پہلے تم دس نشانیاں نہیں دیکھ لو گے۔ پھر آپ نے

---

[24] یہ حدیث صحیح ہے۔
[25] یہ حدیث صحیح ہے۔
[26] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت نہیں کرائیں گے۔

ویأجوج مأجوج، وثلاثة خسوف: — خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب — وآخر ذلك نار تخرج من الیمن، تطرد الناس إلی محشرهم.[27]
(مسلم، رقم 7467)

یہ نشانیاں بتائیں: دھواں، دجال، دابۃ الارض، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ ابنِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول، یاجوج و ماجوج، تین بار زمین کا دھنس جانا — ایک بار مشرق میں، ایک بار مغرب میں اور ایک بار جزیرۃ العرب میں — سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔"

13۔ عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: ينزل عيسى ابن مريم، فيقتل الخنزير، ويمحو الصليب، وتجمع له الصلاة، ويعطي المال حتى لا يقبل، ويضع الخراج، وينزل الروحاء فيحج منها أو يعتمر أو يجمعهما قال: وتلا أبوهريرة: وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا،[28] فزعم حنظلة أن

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ ابنِ مریم نازل ہوں گے۔ پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے۔ اُن کے لیے نماز جمع کی جائے گی۔ وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اُسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ وہ خراج کو ختم کر دیں گے اور رَوحا[29] کے مقام پر اتر کر وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع

[27] یہ حدیث صحیح ہے۔
[28] النساء 4:159۔
[29] مدینہ سے 35 میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

أبا هريرة، قال: يؤمن به قبل موته: عيسى. فلا أدري هذا كله حديث النبي صلى الله عليه وسلم، أو شيء قاله أبو هريرة. (مسند احمد، رقم 7903)

کریں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت پڑھی: "اِن اہل کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کر لے گا اور قیامت کے دن یہ اِن پر گواہی دے گا۔" حنظلہ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اُس کی موت سے پہلے ایمان لائے گا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ ساری بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے یا یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔"

14۔ عن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه سلم عن النبي صلى الله عليه قال: عصابتان من أمتي أحرزهما الله من النار عصابة تغزو الهند وعصابة تكون مع عيسى ابن مريم عليه السلام.[30]

(مسند احمد، رقم 22396)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبان روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے دو گروہوں کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا ہے: ایک وہ گروہ ہے، جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا گروہ وہ ہے، جو عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے ساتھ ہو گا۔"

15۔عن أبي هريرة قال: قال رسول

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے

---

[30] یہ حدیث حسن ہے۔

الله صلی الله علیه وسلم: ینزل عیسی ابن مریم إمامًا عادلاً وحکمًا مقسطًا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویرجع السلم ویتخذ السیوف مناجل وتذهب حمة کل ذات حمة وتنزل السماء رزقها وتخرج الارض برکتها حتی یلعب الصبی بالثعبان فلا یضره ویراعی الغنم الذئب فلا یضرها ویراعی الاسد البقر فلا یضرها.
(مسند احمد، رقم 10261)

روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) امام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ سلامتی کا دور دورہ ہو گا اور تلواروں کی درانتیاں بنا لی جائیں گی اور ہر ڈنک مارنے والے کا ڈنک ختم ہو جائے گا اور آسمان اپنا رزق اتارے گا اور زمین اپنی برکتیں نکال دے گی، حتیٰ کہ چھوٹا بچہ اژدہا کے ساتھ کھیلے گا اور وہ اُسے نقصان نہ پہنچائے گا اور بھیڑیں بھیڑیئے کے ساتھ اکٹھی چریں گی اور وہ اُنھیں نقصان نہ پہنچائے گا اور شیر گائے کی نگہبانی کرے گا اور وہ اُسے نقصان نہ پہنچائے گا۔‘‘

باب دوم

نزولِ مسیح ــــ علما کا موقف

گذشتہ باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع الی اللہ اور نزول الی الارض کے جملہ نصوص سامنے آ گئے ہیں۔ اِن کے بارے میں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کا موقف واضح کرنے سے پہلے علماے امت کے نقطۂ نظر کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اِس کے نتیجے میں وہ پس منظر نمایاں ہو جائے گا، جس میں استاذِ گرامی نے اپنا موقف پیش کیا ہے۔

ہماری علمی روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے تصور کو ''نزولِ مسیح'' کے زیرِ عنوان بیان کیا جاتا ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو تحویل میں لے کر اپنی طرف اٹھا لیا۔ اُس وقت سے تا حال وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ قربِ قیامت میں وہ براہِ راست زمین پر نازل ہوں گے۔ وہ فرشتوں کے ہم راہ دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر اتریں گے اور مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کریں گے۔ پھر وہ دجال اور اُس کے یہودی لشکریوں کو قتل کر دیں گے۔ اُن کی دعا سے یاجوج و ماجوج بھی فنا ہو جائیں گے۔ دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی اور کرۂ ارض پر اسلام کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہے گا۔ وہ چالیس سال تک دنیا پر امام عادل کی حیثیت سے حکمرانی کریں گے۔ اِس کے بعد وفات پا جائیں گے۔ مسلمان آپ کا جنازہ پڑھیں گے اور

آپ کی تدفین کریں گے۔ آپ کی وفات کے بعد جلد ہی قیامت برپا ہو جائے گی۔

علما کے اِس موقف اور اِس کے دلائل کی تفصیل درجِ ذیل عنوانات کے تحت پیش ہے:

- رفع مسیح کے دلائل
- نزولِ مسیح کے دلائل
- تصورِ نزولِ مسیح کے متعلقات

رفع مسیح کے دلائل

حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے اور وہاں زندہ موجود ہونے کے تصور کے لیے قرآنِ مجید سے استدلال کیا جاتا ہے۔ علما و مفسرین کتاب الٰہی کے بعض نصوص کو اِن مباحث کی تائید میں قطعی دلائل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ دلائل اور اِن کا استدلال درجِ ذیل ہے۔

1۔ سورۂ آل عمران (3) کی آیات 54-55 سے استدلال

سورۂ آلِ عمران (3) کی آیات 54 تا 55 سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف خفیہ تدبیریں شروع کیں تاکہ آپ کو کسی جرم کے بہانے مصلوب کیا جا سکے۔ مگر اللہ کے حکم سے وہ ایسا نہیں کر سکے۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو تسلی دی کہ ایسی تدبیروں کی اُس کی قدرت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ ایسی تدبیر کرے گا، جو اُن کی تمام تدبیروں کو اکارت کر دے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی اِس تدبیر سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ. اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ	”اور بنی اسرائیل نے (اُس کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں،

مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.

اور اللہ نے بھی (اِس کے جواب میں) خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کی حفاظت کے لیے اپنی تدبیر کو ’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ‘ (میں تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ مفسرین نے اِن سے رفع مسیح اور حیاتِ مسیح کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ ’رَافِعُكَ اِلَیَّ‘ (میں تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا) سے یہ مطلب لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو زندہ اپنی طرف اٹھالیا تھا۔ چنانچہ وہ آسمانوں پر اپنے جسمانی وجود کے ساتھ بہ قیدِ حیات ہیں۔ جہاں تک ’رَافِعُكَ‘ سے پہلے ’مُتَوَفِّیْكَ‘ (یعنی میں تجھے وفات دوں گا) کے الفاظ کا تعلق ہے تو اِس کا مطلب موت دینا نہیں، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سالم اور سموچا تحویل میں لے لینا ہے۔ چنانچہ ’مُتَوَفِّیْكَ‘ کے الفاظ بجاے خود حیاتِ مسیح کی دلیل ہیں، اِنھیں وفاتِ مسیح کے مفہوم میں استعمال کرنا

درست نہیں ہے۔[31]

---

[31] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'مُتَوَفِّيْكَ' میں 'توفی' کا فعل عموماً وفات، یعنی موت کے مفہوم میں مستعمل ہے اور قرآنِ مجید میں بھی جا بہ جا اِس معنی میں استعمال ہوا ہے تو پھر علما کو اِس متداول مفہوم کے باوجود اِس کے دیگر معانی کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہمارے خیال میں اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اِس کے نتیجے میں قرآن و حدیث میں تعارض واقع ہوتا ہے۔ احادیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور قربِ قیامت میں آپ کے آسمانی نزول کو بالصراحت بیان کرتی ہیں۔ اِس تناظر میں اگر 'توفی' کا معنی فوت ہونا کیا جائے تو مذکورہ آیت اور احادیثِ نزول میں تناقض کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ مسلمہ یہ ہے کہ کلام الٰہی اور قولِ رسول میں منافات ممکن نہیں ہے، لہٰذا اِس تناقض کو ختم کرنا ناگزیر ہے۔ اِس کی دو ہی ممکنہ صورتیں ہیں: ایک یہ کہ آیت کو وفات ہی کے معنی پر محمول کیا جائے اور حیاتِ مسیح اور نزولِ مسیح کی روایات کو اِس سے معارض قرار دے کر یا رد کر دیا جائے یا اُن کی ایسی توجیہ کی جائے، جو وفات کے معنی سے متجاوز نہ ہو۔ دوسری یہ کہ آیت کو روایت کی روشنی میں سمجھا جائے اور 'توفی' کی ایسی تاویل کی جائے، جو حیات کے معنی کی گنجایش پیدا کر دے۔ علما و مفسرین کی اکثریت نے دوسری صورت اختیار کی۔ تاہم، اُن کی ایک قلیل تعداد نے پہلی صورت کو ترجیح دینا مناسب سمجھا۔ اِس بنا پر بادی النظر میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ علما کے اکثریتی گروہ نے احادیث کے بیان کو اصل مانتے ہوئے مذکورہ آیت کی تاویل کی یا بہ الفاظِ دیگر قرآن کو حدیث کی روشنی میں دیکھا۔ اِس صورت میں آلِ عمران کی یہ آیت نہ صرف احادیثِ نزول کی موکد اور مصدق قرار پائی، بلکہ منفرد طور پر حیات اور نزول کے مقدمات کے لیے دلیل بھی بن گئی۔ اِس کے برعکس، اقلیتی گروہ نے آیت کو اصل قرار دیتے ہوئے احادیث کا مطالعہ کیا اور اُنھیں قرآن کے خلاف سمجھا یا دوسرے الفاظ میں اُنھوں نے حدیث کو قرآن کی روشنی میں دیکھا اور معارض جان کر اُن کی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' (میں تجھے وفات دوں گا) کے الفاظ کو موت کے معنی میں نہ لینے کے لیے جو دلائل دیے گئے ہیں، وہ متقدمین سے متاخرین تک ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ گویا یہ اصلاً علماے سلف کا استدلال ہے، جسے بعد میں آنے والوں نے من و عن اختیار کیا ہے۔ ہم نے اِنھیں دورِ جدید کے علما کی کتب سے نقل کیا ہے۔ اِس کا مقصد مواد کا مناسب حد تک احاطہ اور آسان اسلوب میں اُس کی تفہیم ہے۔[32]

علما کے دلائل درجِ ذیل ہیں:

i۔ 'توفی' کا حقیقی معنی موت نہیں ہے

علما و مفسرین کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ اِس آیت کے الفاظ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' میں 'توفی' کے فعل کو بلا تامل موت کے معنی میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے مفہوم میں اِسے مجازی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس کے حقیقی معنی 'أخذ الشیء وافیًا' یا 'أخذ الشیء بتمامه'، یعنی کسی چیز کو پورا لے لینے کے ہیں۔ کسی جملے میں لفظ کے حقیقی یا مجازی مفہوم کا تعین جملے، سیاق و سباق اور کلام کے قرائن سے ہوتا ہے۔ اِس مقام کے قرائن سے واضح ہے کہ یہاں یہ لفظ اپنے مجازی معنی میں نہیں، بلکہ حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' کا معنی یہ ہے کہ میں تم کو پورا پورا لے لوں گا اور اِس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ یعنی اُن کے وجود کے دونوں اجزا ــــ روح اور بدن ــــ اللہ کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ یہ مفہوم عربی لغت کے شواہد اور قرآنِ مجید کے نظائر اور حدیث کی روایات سے بھی مکمل مطابقت رکھتا

---

[32] احاطہ اِس پہلو سے کہ اِن میں علماے سلف کی مجموعی آرا کی عکاسی ہے اور آسان اِس پہلو سے کہ اِنھیں عام فہم اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری کی کتاب ''حیاتِ ابن مریم علیہ السلام''[33] میں بیان ہوا ہے:

''لفظ 'توفیٰ' کو لے لیجیے کہ اِس کے تمام مشتقات کسی چیز کو پورا پورا وصول کرنے کے لیے آتے ہیں، اِسی لیے بڑی اور برگزیدہ شخصیات کی وفات کے لیے بجائے ''موت'' ازراہِ احترام 'توفیٰ' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں کسی ضرورت کے تحت لفظِ ''موت'' بھی استعمال ہوتا ہے۔

الغرض، لفظِ 'توفیٰ' یہاں بلا کسی تردد کے اپنے اصلی معنی میں ہے، اِس سے ذرا بھی ہٹا نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں، کیونکہ یہ لفظ ''موت'' کا مرادف ہو کر بعینہٖ موت کے معنی میں ہوتا تو متکلم کا مقصد، یعنی ستر اور اظہارِ تقدیس جاتا رہتا۔'' (122)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اِس لفظ کو موت کے بجائے وصول کر لینے کے معنی میں لیا ہے۔ تاہم، اِس کی تفسیر اُنھوں نے عہدے سے سبک دوشی کے مفہوم میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصل میں لفظ 'مُتَوَفِّیْكَ' استعمال ہوا ہے۔ 'تَوَفِّی' کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ ''روح قبض کرنا'' اِس لفظ کا مجازی استعمال ہے، نہ کہ اصل لغوی معنی۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (To recall) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، یعنی کسی عہدہ دار کو اُس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمایشوں کے باوجود اُن کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیا کو قتل کر چکے تھے اور ہر اُس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے، جو نیکی اور راستی کی طرف اُنھیں دعوت دیتا تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن پر حجت تمام کرنے اور اُنھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما

---

[33] یہ علامہ کی عربی تصنیف ''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مولانا ابو طلحہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی نے کیا ہے۔

السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بہ یک وقت مبعوث کیا، جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ اُن سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے، جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اِس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ اِن دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ اُن کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقّاصہ کی فرمایش پر قلم کرا دیا، اور اُن کے علما و فقہا نے سازش کر کے حضرت کو رومی سلطنت سے سزاے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اِس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمایش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔" (تفہیم القرآن 1 / 257)

پیر کرم شاہ الازہری نے زبیدی کی "تاج العروس" اور قرطبی کی "الجامع لاحکام القرآن" کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ 'توفی' کا لفظ حقیقی و مجازی، دونوں معانی کا حامل ہے۔ حقیقی معنی پورا لے لینا ہے اور مجازی معنی موت یا نیند ہے۔ زبان و بیان کا اصول یہ ہے کہ حقیقی و مجازی معانی کا حامل کوئی لفظ جب کسی جملے میں استعمال ہو تو اولاً اُسے حقیقی معنی پر محمول کرنا چاہیے۔ اگر جملہ اُسے قبول نہ کرے یا قرائن اُس کے خلاف ہوں تو اُس کے بعد مجازی معنی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ سبقت کرتے ہوئے مجازی معنی کو ترجیح دینا درست نہیں ہے۔ مذکورہ آیت میں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے، جو 'توفی' کو مجازی معنی میں لینے کی دلیل بن سکے۔ اِس کے برعکس، اِسے حقیقی معنی میں لینے کے دو واضح قرائن موجود ہیں: ایک یہ کہ آیات کے شانِ نزول سے معلوم ہے کہ اِن کے مخاطبین نجران کے نصاریٰ ہیں، جو ایک وفد کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ وہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل تھے، اِس لیے یہاں اِسی باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ دوسرا قرینہ نزولِ مسیح کی احادیث ہیں، جو بالصراحت آپ کی حیات کے تصور کو موکد کرتی ہیں۔ چنانچہ

اِن قرائن کا تقاضا ہے کہ یہاں 'توفیٰ' کو اِس کے حقیقی معنی —— پورا لے لینا —— ہی پر محمول کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علم معنی کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی لفظ کا ایک حقیقی معنی ہو اور دوسرا مجازی تو حقیقی معنی کو مجازی معنی پر ترجیح دی جائے گی۔ ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ پایا جائے، جس کے ہوتے ہوئے حقیقی معنی متعذر ہو تو اُس وقت معنی حقیقی کو ترک کر کے معنی مجازی مراد لیا جائے گا۔ لیکن اگر ایسے قوی قرائن موجود ہوں، جو حقیقی معنی مراد لینے کے ہی موید ہوں تو اِس حالت میں حقیقی معنی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے پر اصرار کرنا تو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے۔ اب آپ لفظِ 'توفیٰ' کے معنی پر غور فرمایئے۔ "تاج العروس" میں لفظ 'وفی' کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'وتوفاه ای لم یدع منه شیئًا'۔ یعنی، "پورے کا پورا لے لیا اور اُس سے کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی۔" امام ابی عبد اللہ القرطبی "الجامع لاحکام القرآن" میں لکھتے ہیں: 'توفیت مالی من فلان ای قبضته'۔ یعنی، "میں نے اُس سے سارا مال واپس لے لیا۔" یہ تو ہے لفظ 'توفیٰ' کا حقیقی معنی۔

ہاں یہ موت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، لیکن یہ اِس کا مجازی معنی ہے، جیسے صاحبِ "تاج العروس" نے لکھا ہے۔ 'ومن المجاز ادرکته الوفاة ای الموت والمنیة وتوفی فلان اذ مات و توفاه اللہ عزوجل اذا قبض روحه'۔ اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک لفظ کا حقیقی معنی ترک کر کے بغیر قرینہ کے اُس سے مجازی معنی اخذ کرنے پر اصرار کرنا اِس لفظ کے ساتھ کتنی بے جا زیادتی ہے۔ اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں کہ مجازی معنی لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں، بلکہ ایسے قوی قرائن موجود ہیں، جو اِس لفظ کے حقیقی معنی لیے جانے پر دلالت کرتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ وہ کون سے ایسے قرائن ہیں تو اِس کے متعلق عرض ہے کہ ایک تو اِس آیت کا سیاق وسباق اِس امر کا قوی قرینہ ہے۔ یہاں گفتگو نجران کے عیسائیوں سے ہو رہی ہے، جو حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل تھے۔ مقصدِ کلام ہے: اثباتِ توحیدِ باری اور بطلانِ الوہیتِ مسیح۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہوتے تو کتنی صاف بات تھی

کہ نجران کے عیسائیوں سے کہہ دیا جاتا کہ جن کو تم خدا مانتے ہو، وہ تو مر چکے ہیں اور جو مر جائے کیا وہ بھی کہیں خدا بن سکتا ہے! لیکن قرآن کا اِس اسلوب کو اختیار نہ کرنا، بلکہ اِس انداز کو اپنانا اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کی اِس آیت کا مدعا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کو بیان کرنا نہیں۔

دوسرا واضح قرینہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ ارشادِ گرامی ہے: 'قال الحسن قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالی علیہ وآلہ وسلم للیہود ان عیسیٰ لم یمت وانہ راجع الیکم قبل یوم القیامۃ'، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور قیامت سے پہلے وہ تمھاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔" اِن تصریحات کی موجودگی میں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی مراد نہیں ہو سکتا۔ اِسی لیے جمہور مفسرین اِس حقیقی معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

'متوفیک ای مستوفی اجلک ومؤخرک الی اجلک المسمی عاصمًا ایاک عن قتلھم'۔ (بیضاوی) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی مقررہ مدت تک زندہ رکھے گا اور تمھیں قتل سے بچائے گا۔"۔ 'متوفیک ای مستوفی اجلک معناہ انی عاصمک من ان یقتلک الکفار'۔ (الکشاف)۔ امام ابن جریر لکھتے ہیں: 'واولی الاقوال بالصحۃ عندنا قول من قال معنی ذلک انی قابضک من الارض ورافعک الیّ لتواتر الاخبار من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم'۔ یعنی میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھے زمین سے قبض کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں، کیونکہ حضورِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیثِ متواترہ سے یہی چیز ثابت ہے کہ آپ کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا۔"

(ضیاء القرآن 1 / 235-236)

ii۔ 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' کے الفاظ 'توفی' کے مجازی معنی لینے میں مانع ہیں

یہ درست ہے کہ 'توفی' کا فعل موت کے مجازی مفہوم میں بھی مستعمل ہے، مگر یہاں

اِسے اِس مفہوم میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جملہ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ' تک محدود نہیں ہے، اِس کے بعد 'رَافِعُکَ اِلَیَّ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ الفاظ مانع ہیں کہ 'توفی' کو موت کے معنی پر محمول کیا جائے۔

اِس ضمن میں مولانا مودودی کا استدلال یہ ہے کہ آلِ عمران کی یہ آیات درحقیقت مسیحیوں کے اُس باطل عقیدے کی تردید میں نازل ہوئی ہیں، جس کے مطابق وہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل تھے۔ آیات کا یہ تناظر متقاضی ہے کہ اگر آپ وفات پا چکے ہوتے تو یہاں محتمل المعانی اسلوب کے بجاے ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا، جو مر کر مٹی ہو جانے کے لیے قطعی اور صریح ہوتا۔ مگر قرآن نے، اِس کے برعکس 'رَافِعُکَ اِلَیَّ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ الفاظ نہ صرف موت کے مفہوم میں صریح نہیں ہیں، بلکہ اِن میں حیات کے مفہوم کا پورا احتمال موجود ہے۔ عقیدۂ الوہیت کی تردید کے محل میں یہ اسلوب اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ نے آپ کو موت دیے بغیر زندہ اپنی طرف اٹھالیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیّتِ مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے۔ اور عیسائیوں میں اِس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے:
>
> 1۔ حضرت مسیح کی اعجازی ولادت۔
>
> 2۔ اُن کے صریح محسوس ہونے والے معجزات۔
>
> 3۔ اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا، جس کا ذکر صاف الفاظ میں اُن کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔
>
> قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیح کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریق پیدایش ہر گز اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیح خدا تھا یا خدائی میں کچھ بھی حصّہ رکھتا تھا۔
>
> دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود مسیح کے معجزات ایک ایک کر کے

گنائے، مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اُس نے اللہ کے اذن سے کیے تھے، باختیارِ خود کچھ بھی نہیں کیا، اِس لیے اِن میں سے بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے، جس سے تم یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ بھی حق بہ جانب ہو کہ مسیح کا خدائی میں کوئی حصّہ تھا۔

اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی روایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی تب تو اِن کے عقیدۂ الوہیّتِ مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم الٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو، وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فلاں مقام پر جا کر اُس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ اُن کی موت کی تصریح نہیں کرتا، اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، جو زندہ اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے۔ یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ''ایلی ایلی لما شبقتانی''[34] کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو، وہ مسیح نہ تھا، مسیح کو تو اُس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا۔

اِس کے بعد جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلك۔''

(تفہیم القرآن 1/ 257-258)

علامہ انور شاہ کشمیری کی دلیل یہ ہے کہ 'توفی' کے اصل معنی پورا لے لینے کے ہیں۔ موت کے معنی میں یہ لفظ بہ طورِ کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ زبان کا مسلمہ ہے کہ کوئی لفظ کنایۃً

---

[34] یہ زبور کی ایک آیت ہے۔ اِس کا مفہوم ہے: ''اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟'' (زبور 22:1)۔ انجیل کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا گیا تو اُس حالت میں اُنھوں نے پکار پکار کر یہ الفاظ دہرائے تھے (متی 27:46)۔

بھی استعمال ہو، تب بھی اپنے حقیقی مفہوم کو شامل رہتا ہے، اُس سے علیحدہ یا متغائر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ 'توفی' جب موت کے مجازی معنی میں آئے تو اتمام و اکمال کے حقیقی معنی اِس میں شامل ہوتے ہیں، وہ کسی حال میں اِس سے منفک نہیں ہوتے۔ اِس صورت میں اِس سے ابدی مرگ مراد ہوتی ہے، جو زندگی سے مبرا ایک مکمل اور مستقل امر کا نام ہے۔ تاقیامت اِس کے درمیان ایسا کوئی رخنہ نہیں ہوتا، جو زندگی سے عبارت ہو یا زندگی کو لازم کرتا ہو۔ بہ الفاظِ دیگر 'توفی' کا لفظ اِس بنا پر موت کے لیے موزوں اور مستعمل ہوا ہے کہ موت نہ ادھوری ہوتی ہے، نہ منقسم ہوتی ہے، بلکہ سالم اور کامل ہوتی ہے۔

آلِ عمران کی مذکورہ آیت میں 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' کے الفاظ چونکہ زندگی کو لازم کرتے ہیں، اِس لیے 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' کو موت کے معنی پر محمول کرنے کی صورت میں اضافی اور غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ یہ 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' سے اُسی صورت میں مربوط ہو سکتے ہیں، جب 'توفی' کو موت کے بجائے پورا وصول کرنے کے معنی پر محمول کیا جائے۔ پھر یہ پوری طرح متعلق اور با معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اگر ارشادِ باری: 'انی متوفیك' میں 'متوفی' بہ معنی 'ممیت' ہوتا تو 'رافعك الی' کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ اِس وقت 'توفی' جو موت کے معنی میں مشہور ہے، وہ کنایۃً ہے نہ کہ وضعاً۔ ...اِس لیے میری تحقیق یہ ہے کہ لفظ کا اصل مفہوم ہی بتقاضاے بلاغت لفظ کا مصداق ہوتا ہے۔... پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ: میں آپ کو وہ پوری مدت دے دوں گا، جو آپ کے لیے مقدر ہے، آپ کے دشمن آپ کے قتل پر قادر نہ ہو سکیں گے، بلکہ میں آپ کو طبعی موت دوں گا۔
>
> 'توفی' از ابتدا تا انتہا ساری عمر کو محیط ہے اور اِس کے بیچ میں 'رفع' ہے۔ پس چونکہ 'توفی' عمر کے دونوں سروں میں ہے (اِس لیے 'توفی' کا تذکرہ پہلے کیا) اور 'رفع' وسط میں ہے، اس لیے اِس کو موٴخر کیا، لہٰذا یہ اوقات میں عمر کو پورا کرنا ہوا۔ ...حاصل یہ کہ حضرت عیسیٰ کی بابت 'توفی' کی بات جبھی ہو سکتی ہے، جب کہ آپ پوری عمر گزاریں اور

ایسا نزول کے بعد ہو گا۔ سورۂ مائدہ میں اِسی کا تذکرہ ہے۔ ایسا نہیں کہ یہاں دو 'توفی' پائی جا رہی ہیں، ایک رفع سے پہلے، دوسری نزول کے بعد اور نہ ہی یہ کہنا صحیح ہے کہ 'متوفيك ورافعك إلى 'میں تقدیم و تاخیر ہے۔" (حیات ابن مریم 127-128)

iii۔ 'رَافِعُكَ' سے مراد جسم اور روح، دونوں کا اٹھایا جانا ہے

یہ گذشتہ استدلال ہی کا ایک جز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ بہ طورِ انسان عیسیٰ علیہ السلام کی ذات روح اور جسم، دونوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے 'رَافِعُكَ اِلَیَّ'، "میں آپ کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں" کہا گیا تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ اُس انسان کو اٹھانے والے ہیں، جو عیسیٰ کے اسم کا مصداق ہے اور اِس بنا پر روح اور جسم، دونوں کا مجموعہ ہے۔ گویا اگر اکیلی روح یا اکیلے جسم کو اٹھایا گیا ہوتا تو پھر بیان یہ ہوتا کہ میں آپ کی روح کو اٹھانے والا ہوں یا میں آپ کے جسم کو اٹھانے والا ہوں۔ اِس تصریح کے بغیر اگر حضرت مسیح کو اٹھانے کی بات ہوئی ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں حضرت مسیح کا پورا وجود اٹھانا مقصود ہے، جو جسم اور روح، دونوں سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔ مفتی شفیع عثمانی نے "معارف القرآن" میں لکھا ہے:

> "(ورافعك الى) اِس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف روح کا نہیں، بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہوا، جسمانی نہیں اٹھایا گیا، بالکل غلط ہے۔" (76/2)

لفظِ 'اِلی' کی تاکید کو نمایاں کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

> "اِس جگہ لفظِ 'رفع' کے ساتھ لفظِ 'الی' استعمال فرما کر اِس مجازی معنی کا احتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اِس آیت میں 'رافعك الیّ' فرمایا، اور سورۂ نسا کی آیت میں بھی جہاں

یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا، وہاں بھی یہی فرمایا: 'وما قتلوہ یقینًا بل رفعه اللّٰه الیه'۔ یعنی یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ اُن کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ اپنی طرف اٹھالینا روح مع جسد کے زندہ اٹھالینے ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔" (76/2)

iv۔ سیاقِ کلام تسلی کا ہے، جب کہ موت خلافِ تسلی ہے

ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ یہاں حضرت مسیح علیہ السلام کو اُن کے دشمنوں سے بچانے کی اطمینان دہانی کرائی گئی ہے۔ اُنھیں بتایا گیا ہے کہ دشمنوں کی سب سازشیں ناکام ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ اُنھیں ہر طرح سے محفوظ رکھیں گے۔ اِس تسلی و تشفی کے موقع پر زندگی کے خاتمے کی ایک غیر تسلی بخش خبر کیسے دی جا سکتی ہے؟ موت کی صورت میں تو تسلی اور اطمینان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی اِس دلیل کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمہور صحابہ و تابعین اور عامۂ سلف صالحین یہ کہتے ہیں کہ اِس آیت میں 'توفی' سے موت کے معنی مراد نہیں، بلکہ 'توفی' کے اصلی اور حقیقی معنی مراد ہیں، یعنی کسی شے کا پورا پورا لے لینا، کیونکہ دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ کے وقت 'توفی' کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی اور تسکین کے لیے ہے کہ اے عیسیٰ تم دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ سے گھبرانا نہیں۔ میں تم کو پورا پورا روح اور جسم سمیت اِن نابکاروں سے چھین لوں گا۔ تیرا وجود اِن کے لیے میری ایک عظیم نعمت تھا۔ اِن کے کردار سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نابکار اور ناہنجار اِس قابل نہیں کہ تیرے وجود کی نعمت کو اِن کے لیے باقی رکھا جائے۔ اِن کی ناقدری اور ناسپاسی کی سزا یہ ہے کہ اِن سے یہ نعمت پوری پوری واپس لے لی جائے۔...

غرض یہ کہ آیت میں 'توفی' سے پورا پورا لے لینے کے معنی مراد ہیں۔ موت کے معنی مراد نہیں اور نہ اِس مقام کے مناسب ہیں، اِس لیے کہ جب ہر طرف خون کے پیاسے اور

جان لیوا کھڑے ہوئے تو اُس وقت تسلی اور تسکین خاطر کے لیے موت کی خبر دینا کہ میں تجھ کو موت دوں گا مناسب نہیں۔ دشمنوں کا تو مقصود ہی جان لینا ہے۔ اُس وقت تو مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم گھبراؤ نہیں ہم تم کو تمھارے دشمنوں کے نرغہ سے پورا پورا اور صحیح و سالم نکال لے جائیں گے کہ دشمنوں کو تمھارا سایہ بھی نہ مل سکے گا۔ پس اگر آیت میں 'توفی' سے موت کے معنی مراد ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی تو نہ ہو گی، البتہ یہود کی تسلی ہو جائے گی اور مطلب یہ ہو گا کہ یہود تم بالکل نہ گھبراؤ اور نہ مسیح کے قتل کی فکر کرو، میں خود ہی اِن کو موت دوں گا۔ اور میں خود ہی تمھاری تمنا اور آرزو پوری کر دوں گا، تمھیں کوئی مشقت نہ ہو گی۔ یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی نہ ہوئی، بلکہ یہود کی تسلی ہوئی۔" (معارف القرآن 1/ 629-630)

v۔ 'مُتَوَفِّيْكَ' کو 'رَافِعُكَ' سے موخر سمجھ کر موت کا معنی لیا جا سکتا ہے

بعض اہل علم کے نزدیک یہاں 'توفی' موت ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، مگر بہ اعتبارِ وقوع یہ رفع سے موخر ہے۔ یعنی آیت کے بیان کی جو ترتیب 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ' میں ہے، یہ ترتیبِ زمانی نہیں ہے۔ اِس میں 'توفی' بہ معنی موت اگرچہ مقدم الذکر ہے، مگر وقوع کے لحاظ سے موخر ہے۔ اور رفع بہ معنی زندہ اٹھا لینا موخر الذکر ہے، مگر وقوع کے لحاظ سے مقدم ہے۔ 'توفی' کی تقدیم سے احادیث میں مذکور اُس عظیم الشان واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، جو نزول مسیح سے شروع ہو کر وفات مسیح پر مکمل ہو گا اور آپ کو قتل اور صلیب کی بے حرمتی سے محفوظ کر کے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ طبعی موت دی جائے گی۔ مزید برآں، اِس تقدیم سے عیسائیوں کے الوہیتِ مسیح کے باطل نظریے کی تردید کو بھی نمایاں فرمایا ہے اور واضح کیا ہے کہ حضرت مسیح نوعِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن پر اُسی طرح موت آئے گی، جس طرح باقی انسانوں پر آتی ہے۔

اِس ضمن میں اگر کوئی شخص ’رَافِعُكَ‘ کے ’مُتَوَفِّيْكَ‘ پر معطوف ہونے کا اعتراض اٹھائے اور یہ خیال کرے کہ ترتیبِ بیان کے باعث موت کے واقعے کو رفع کے واقعے پر مقدم سمجھنا ضروری ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ عطف کی واوٴ ترتیبِ وقوع پر دلالت نہیں کرتی۔ قرآنِ مجید میں اِس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعد میں ہونے والے واقعے کو پہلے بیان کر دیا ہے۔

مفتی شفیع عثمانی لکھتے ہیں:

”تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس طرح منقول ہے:

”اسحاق بن بشر اور ابن عساکرنے بروایت جوہر عن الضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت ’انی متوفيك ورافعك الیّ‘ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کیے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا، پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا۔“(36/2)

اِس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ’توفیٰ‘ کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے۔ (رافعك) کا پہلے اور (متوفيك) کا وقوع بعد میں ہو گا، اور اِس موقع پر ’متوفيك‘ کو مقدم ذکر کرنے کی حکمت و مصلحت اِس پورے معاملے کی طرف اشارہ کرنا ہے، جو آگے ہونے والا ہے، یعنی یہ اپنی طرف بلا لینا ہمیشہ کے لیے نہیں، چند روزہ ہو گا اور پھر آپ اِس دنیا میں آئیں گے اور دشمنوں پر فتح پائیں گے، اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہو گی، اِس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کی تکمیل بھی، نیز اِس میں عیسائیوں کے عقیدہٴ الوہیت کا ابطال بھی تھا، ورنہ اُن کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے اِن کا یہ عقیدہٴ باطل اور پختہ ہو جاتا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرح حی و قیوم ہے، اِس لیے پہلے ’متوفيك‘ کا لفظ ارشاد فرما کر اِن تمام خیالات کا ابطال کر دیا پھر اپنی طرف بلانے کا ذکر فرمایا۔...

(حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات سے متعلق) یہی عجائب قدرت تو جاہل نصاریٰ کے

لیے اِس عقیدہ میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے، کہ اُن کو خدا کہنے لگے، حالانکہ اِنھی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعہ میں اُن کی عبدیت و بندگی اور تابع فرمانِ الٰہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں، اور اِسی لیے ہر ایسے موقع پر قرآنِ حکیم نے عقیدۂ الوہیت کے ابطال کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ آسمان پر اٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا، اِس لیے 'متوفیك' کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اِس تقدیم و تاخیرِ الفاظ کے ذریعہ اِسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ خدا نہیں، جو موت سے بری ہوں، ایک وقت آئے گا، جب اُن کو بھی موت آئے گی۔" (معارف القرآن 2/74-76)

2۔ سورۂ نساء (4) کی آیات 156-159

یہ آیات سورۂ نساء کے اختتامی اجزا میں سے ہیں۔ اِس مقام پر بیان ہوا ہے کہ یہود نے سیدہ مریم علیہا السلام پر بہتان طرازی کی اور پھر اُن کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اِس پر یہ جھوٹا دعویٰ کیا کہ وہ اِس گھناؤنی حرکت میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس سازش میں ناکام رہے تھے اور اللہ نے اُنھیں شبہے میں مبتلا کر کے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا. وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ	"پھر اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا، اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابنِ مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔ حالاں کہ فی الواقع اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا، نہ صلیب

مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًۢا. بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا. وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا.

پر چڑھایا، بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اِس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، اُن کے پاس اِس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ اُنھوں نے مسیح کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اُس کو اپنی طرف اٹھا لیا، اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا، جو اُس کی موت سے پہلے اُس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ اُن پر گواہی دے گا۔“[35]

اِس مقام سے عیسیٰ علیہ السلام کی حیات پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اِس ضمن میں علما کا استدلال دو نکات پر مبنی ہے:

i۔ ’وَمَا قَتَلُوۡهُ‘ کے الفاظ موت کا مفہوم لینے میں مانع ہیں

سورۂ نساء(4) کی آیت 157 میں ’وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ‘، ”حالاں کہ فی الواقع اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا، نہ صلیب پر چڑھایا“ کے الفاظ بھی عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی تردید کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل آپ کی موت پر قادر نہ ہو سکے۔ وہ نہ آپ کو قتل کر کے

[35] ترجمہ از ”تفہیم القرآن“۔

مار سکے اور نہ صلیب دے کر مار سکے۔ مقتول اور مصلوب ہونے کی یہ نفی درحقیقت موت کی نفی کے مترادف ہے۔ آیت کا اختتام ’وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا‘، ”اُنھوں نے مسیح کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا“ کے الفاظ پر ہوتا ہے، جس سے موت کی پرزور تردید ہو گئی ہے۔ اِس زور دار تردید کے بعد یہ درست نہیں ہے کہ آلِ عمران (3) کی آیت 55 میں ’توفیٰ‘ کے لفظ کو—جو موت کے معنوں میں صریح نہیں ہے—موت کے مفہوم پر محمول کیا جائے۔

قاضی ثنا اللہ ”تفسیر مظہری“ میں لکھتے ہیں:[36]

ان المراد بالتوفی هو الرفع الی السماء بلا موت يشهد به الوجدان بعد ملاحظة قوله تعالى—وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ—ولولا نفي الموت عنه لما كان من نفي القتل فائدة إذ الغرض من القتل الموت. (56/2)

””توفیٰ‘ سے مراد بغیر موت کے آسمانوں کی طرف اٹھانا ہے، کیونکہ رب العٰلمین کے اِس ارشاد: ’وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ‘ کے ملاحظہ کے بعد وجدان اِس بات کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ اگر موت کی نفی نہ کی جائے تو قتل کی نفی کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ قتل سے غرض بھی تو موت ہوتی ہے۔“

---

[36] اِس دلیل کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے: ملک کا حکمران اگر یہ اعلان کرے کہ میں فلاں محسن قوم کے خلاف جلاوطنی کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا، اُس کے دشمن نہ اُسے اغوا کر سکیں گے اور نہ ملک سے نکال سکیں گے۔ اِس کے بعد اگلے ہی جملے میں اگر وہ یہ کہے کہ اِس محسن کو میں خود باہر نکال دوں گا تو اِس باہر نکالنے کا معنی دشمنوں کے نرغے سے باہر نکالنا تو ہو سکتا ہے، ملک سے باہر نکالنا نہیں ہو سکتا، کیونکہ ملک سے باہر نکالنے کا معنی لینے کی صورت میں سازش عملاً کامیاب ہو جائے گی۔ یعنی حکمران وہی کام کر دے گا، جو دشمن کا مقصود تھا۔

ii۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اہل کتاب کا آپ پر ایمان

آیت 159 کے الفاظ ہیں: 'وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا'، ''اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اُس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اُس (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اُن پر گواہی دے گا۔'' علما و مفسرین کے نزدیک اِس کے الفاظ 'لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ' میں دونوں مفعولی ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ مراد یہ ہے:

'اہل کتاب میں سے ہر شخص عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر لازماً ایمان لائے گا۔'

اِس تاویل کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا اثبات ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ آیت کی رو سے مسیح علیہ السلام کی موت اور اہل کتاب کا آپ پر ایمان لانا لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی آپ کی موت اُس وقت واقع ہو گی، جب آپ کے یہ منکرین آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ اگر رفع الی اللہ کے موقع پر آپ کی موت واقع ہونی تھی تو لازم تھا کہ اُس سے پہلے آپ کے قتل کی سازش کرنے والے یہود آپ پر ایمان لے آتے۔ اِسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ رفع الی اللہ سے تاحال یہود کا ہر فرد آپ پر ایمان لا چکا ہوتا اور گذشتہ دو ہزار سالوں میں دنیا یہود کے وجود سے مسلسل خالی ہوتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اِن دونوں میں سے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اگر ایسا نہیں ہوا اور یقیناً نہیں ہوا تو اِس کا صاف مطلب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ و سلامت ہیں، اُنھیں موت لاحق نہیں ہوئی ہے۔

بعض دیگر مفسرین کے نزدیک 'لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ' کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور 'قَبۡلَ مَوۡتِهٖ' کی ضمیر کا مرجع اہل کتاب کا ہر فرد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے:

'اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر لازماً ایمان لائے گا۔'

اِس سے مراد یہ لیا گیا ہے کہ یہود کا ہر شخص موت کو سامنے پا کر حضرت مسیح کی رسالت

پر یقین کر لے گا اور مرنے سے چند لحظے پہلے آپ پر ایمان لے آئے گا۔

اِس بنا پر علما کا موقف ہے کہ یہ آیت نزولِ مسیح کی روایات کی موید اور موکد ہے۔ اِن دونوں کے مطالب کو یک جا کیا جائے تو مسیح علیہ السلام کی حیات اور نزول کا تصور بر حق ثابت ہوتا ہے۔ اِس موقف کو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اُس قول سے مزید تقویت ملتی ہے، جس میں اُنھوں نے سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کو نزولِ مسیح کی احادیث کی تائید میں پیش کیا ہے۔ مفتی محمد شفیع عثمانی اِس موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''موتہ' کی ضمیر حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگرچہ اِس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے، یہود تو اُنھیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اُنھیں العیاذ باللہ مفتری اور کاذب قرار دیتے ہیں اور نصاریٰ اگرچہ اُن پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بعض تو اُن میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ یہود ہی کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے اور بعض اعتقاد کے غلو میں اِس حد تک آگے نکل گئے کہ اُنھیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ قرآنِ کریم کی اِس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اِس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اِس زمین پر پھر نازل ہوں گے تو یہ سب اہل کتاب اُن پر صحیح ایمان لے آئیں گے۔ نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے، قتل کر دیے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے۔ اُس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا اور اِس زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہو گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے:

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیز کو قتل کر دیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور اُس وقت عبادت صرف پروردگارِ عالم کی ہو گی۔ اِس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی

اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآنِ کریم کی یہ آیت بھی پڑھ لو، جس میں اِسی حقیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ: "اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ اُن پر اُن کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا۔ آپ نے فرمایا: "عیسیٰ کی موت سے پہلے"۔ اور تین بار اِن الفاظ کو دہرایا۔"

آیتِ مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بروایت صحیحہ ثابت ہے، جس میں 'قبل موتہ' سے مراد 'قبل موت عیسیٰ' قرار دیا ہے، جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے متعلق ہے۔

اِس تفسیر کی بنا پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور اُن کے نزول سے اللہ جل شانہ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں، وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اِس زمین پر ہی اُن کی وفات ہو گی۔...

خلاصہ یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ 'قبل موتہ' کے ساتھ جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح کے ساتھ تفسیر کو شامل کیا جائے تو اِس سے واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ ہونا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہو کر یہود پر مکمل غلبہ پانا ثابت ہو جاتا ہے۔" (معارف القرآن 2/ 603-605)

دوسری تاویل کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے کسی فرد کی اچانک موت کی صورت میں یہ موقع کیسے پیدا ہو گا کہ وہ حضرت مسیح کی رسالت کا ادراک کر کے اُس پر ایمان لے آئے؟ اِس کے جواب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔ اُن میں بیان ہوا ہے کہ ہر یہودی اپنی موت سے معاً پہلے آپ کی نبوت کا لازماً اقرار کر لے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اِن اقوال کو امام جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر "درِ منثور" میں نقل کیا ہے:

قیل لابن عباس: أرأیت إن خر من فوق بیت قال: یتکلم به فی الهواء فقیل: أرأیت إن ضرب عنق أحدهم قال: یتلجلج بها لسانه وأخرج ابن جریر عن ابن عباس قال: لو ضربت عنقه لم تخرج نفسه حتی یؤمن بعیسی.(733/2)

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ عرض کی گئی کہ اگر وہ (یہودی) مکان سے گرے تو پھر آپ کیا کہتے ہیں؟ فرمایا: (زمین پر گرنے سے پہلے) وہ ہوا ہی میں اِس بارے میں زبان سے اظہار کر دے گا۔ پوچھا گیا کہ اگر اُن (یہودیوں) میں سے کسی کی گردن اڑائی جائے؟ اُنھوں نے فرمایا: وہ اپنی زبان سے جلدی جلدی اِسے ادا کرے گا۔ امام ابنِ جریر نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اگر کسی یہودی کی گردن اڑائی جائے تو اُس کی روح اُس وقت تک نہیں نکلتی، جب تک وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔“

نزولِ مسیح کے دلائل

حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان سے زمین پر نازل ہونے کے تصور کے لیے احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ علما و مفسرین اِس موضوع کی جملہ احادیث کو اِس کی تائید میں قطعی دلائل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک قرآنِ مجید کا تعلق ہے تو اُس میں ایسی کوئی نص نہیں ہے، جو نزولِ مسیح پر براہِ راست اور بالصراحت دلالت کر رہی ہو۔ تاہم، علما کے نزدیک قرآن کی بعض آیات میں ایسے اشارات موجود ہیں، جو نزولِ مسیح کی تائید کرتے ہیں۔ اِن میں اصل حیثیت تو رفع مسیح اور حیاتِ مسیح کی مذکورہ بالا آیات ہی کو حاصل ہے۔ اِن کے علاوہ سورۂ زخرف (43) کی آیت 61 میں مسیح علیہ السلام کے لیے قیامت کی نشانی کے الفاظ بھی آپ کے نزول کی تصویب کرتے ہیں۔

چنانچہ رفع مسیح اور حیاتِ مسیح کی آیات اور نزولِ مسیح اور وفاتِ مسیح کی احادیث کو باہم دگر سمجھا جائے تو اللہ کی پوری اسکیم واضح ہو جاتی ہے۔ آیات کو پڑھیے تو وہ مسیح علیہ السلام کے رفع اور حیات کو ثابت کرتی اور نزول کے اشارات کو نمایاں کرتی ہیں۔ احادیث کو دیکھیے تو اُن سے آپ کے نزول اور اُس کے بعد وفات کا اثبات ہوتا ہے۔ یہ اثبات آپ کے رفع اور آپ کی حیات کو لازم کرتا ہے،[37] لہٰذا یہ احادیث مذکورہ آیات کی موید اور موکد قرار پاتی ہیں۔

---

[37] مطلب یہ ہے کہ نزول اُسی صورت میں ممکن ہے، جب رفع ہو چکا ہو۔ اِسی طرح وفات اُسی

اِس تمہید کے بعد اب نزولِ مسیح کے باب میں علما کے دلائل کی تفصیل ملاحظہ کر لیجیے:

1۔ نزولِ مسیح کے تصور کی اساس: احادیث

علما کے نزدیک نزولِ مسیح کا تصور احادیث پر مبنی ہے۔ اِس موضوع کی روایتیں صحیح اور حسن اسناد کے ساتھ حدیث کی بیش تر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ اُن میں بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے براہِ راست زمین پر نازل ہوں گے۔ وہ دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر اتریں گے اور مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کریں گے۔ پھر وہ دجال اور اُس کے یہودی لشکریوں کو قتل کر دیں گے۔ اُن کی دعا سے یاجوج وماجوج بھی فنا ہو جائیں گے۔ دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی اور کرۂ ارض پر اسلام کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہے گا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ''تفہیم القرآن'' میں نزولِ مسیح کی نمایندہ احادیث درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہ جملہ 21 روایات ہیں جو 14 صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔... یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں، جو اب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ... اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اُسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اور چیز پر مبنی نہیں ہے۔''(4/162)

صورت میں ہو سکتی ہے، جب حیات بر قرار ہو۔

2۔ نزولِ مسیح کی روایات میں تواتر

علما کے نزدیک نزولِ مسیح کی روایات بہ کثرت بھی ہیں اور متواتر بھی ہیں۔ اِن کی نوعیت عام اخبارِ آحاد کی نہیں ہے، جو چند راویوں سے مروی ہوتی ہیں۔ اِنھیں متعدد صحابہ نے بیان کیا ہے، کئی راویوں نے روایت کیا ہے اور بیش تر محدثین نے نقل کیا ہے۔

امام ابنِ کثیر بیان کرتے ہیں کہ نزولِ مسیح کی روایات حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اِن روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے۔ اُس موقع پر آپ کی حیثیت ایک عادل حکمران کی ہو گی۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے:

وقد تواترت الاحاديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه أخبر بنزول عيسى عليه السلام قبل يوم القيامة إمامًا عادلاً وحكمًا مقسطًا. (169/4)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث اِس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام امام عادل اور منصف حکمران کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔“

امام شوکانی بھی نزولِ مسیح کی روایتوں کو من جملہ متواترات سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خروجِ دجال کی روایتیں بھی اِسی زمرے میں شامل ہیں۔ سنن ابوداؤد کی شرح ”عون المعبود“ میں اُن کا موقف اِن الفاظ میں نقل ہوا ہے:

وقال الشوكاني: وجميع ما سقناه بالغ حد التواتر ... الاحاديث الواردة فى المهدى المنتظر متواترة والاحاديث الواردة فى الدجال متواترة والاحاديث الواردة فى نزول

”اور شوکانی نے کہا ہے کہ وہ سب روایتیں جو ہم نے بیان کی ہیں، حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں ... چنانچہ جو احادیث ظہورِ مہدی، خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ کے بارے میں آئی ہیں، وہ سب

عیسی علیہ السلام متواترۃ.   حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔“

(308/11)

3۔ سورۂ زخرف (43) کی آیت 61

سورۂ زخرف (43) کی آیت 61 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ اِس کے لیے ’وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی آپ قیامت کی ایک علامت ہیں۔ جب کسی امر کو قیامت کی علامت کہا جائے گا تو اُس کا تعلق، ظاہر ہے، قربِ قیامت سے ہو گا۔ کتبِ حدیث کی متعدد روایات میں قیامت کے مختلف آثار بیان ہوئے ہیں۔ اُنھی میں سے بعض روایات میں نزولِ مسیح کو قیامت کی نشانی شمار کیا گیا ہے۔ اِسی بنا پر علما کا موقف ہے کہ مذکورہ آیت میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو جس پہلو سے قیامت کی نشانی کہا گیا ہے، وہ آپ کا آسمان سے نازل ہونا ہے۔ چنانچہ یہ آیت روایات میں مذکور نزولِ مسیح کے واقعے کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔

آیت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ درج ذیل ہے:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ. وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ. اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ. وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ. وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. وَ لَا

”اور جونہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی، تمھاری قوم کے لوگوں نے اِس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمھارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابن مریم اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا، جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے

يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ.(62-57:43)

لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔ ہم چاہیں تو تم سے فرشتے پیدا کر دیں، جو زمین میں تمھارے جانشین ہوں۔ اور وہ (ابن مریم) دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے۔ پس تم اِس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو، یہی سیدھا راستہ ہے، ایسا نہ ہو، شیطان تم کو اِس سے روک دے کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔"[38]

بیش تر مفسرین کا یہی موقف ہے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں بیان ہوا ہے:

"یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ اِس لیے کہ اوپر سے ہی آپ علیہ السلام کا بیان چلا آ رہا ہے۔ اور یہ واضح رہے کہ مراد یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے کا نازل ہونا ہے۔ جیسے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: 'وان من اهل الكتاب الا ليومنن به قبل موته'۔ یعنی اُن کی موت سے پہلے ایک ایک اہل کتاب اُن پر ایمان لائے گا۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے۔ پھر قیامت کے دن یہ اُن پر گواہ ہوں گے۔ اِس مطلب کی پوری وضاحت اِسی آیت کی دوسری قراءت سے ہوتی ہے، جس میں ہے 'انه لعلم للساعة' یعنی جناب روح اللہ نشان اور علامت ہیں قیامت کے قائم ہونے کی۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ نشان ہیں قیامت کے، یعنی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا قیامت سے پہلے آنا۔ اِسی طرح روایت کی گئی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور یہی مروی ہے ابو العالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ سے اور متواتر

---

[38] ترجمہ از "تفہیم القرآن"۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام عادل اور حاکم با انصاف ہو کر نازل ہوں گے۔ پس تم قیامت کا ہونا یقینی جانو، اِس میں شک شبہ نہ کرو۔" (تفسیر ابن کثیر 4/631، ترجمہ: مولانا محمد جوناگڑھی)

مولانا محمد مالک کاندھلوی لکھتے ہیں:

"جمہور مفسرین کے نزدیک 'وَاِنَّہٗ' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یعنی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بے شک، ایک علامت ہیں قیامت کے لیے۔ اور اِس سے مراد اُن کا آسمان سے نزول فرمانا اور زمین پر آنا ہے، تو اُن کا یہ آنا من جملۂ علامات قیامت کے ایک عظیم نشانی بنایا گیا۔"[39] (معارف القرآن 7/307)

[39] یہ مولانا ادریس کاندھلوی کی تفسیر "معارف القرآن" کا اقتباس ہے۔ پانچویں جلد کی تکمیل کے بعد وہ وفات پا گئے تھے۔ لہٰذا باقی اجزا اُن کے بیٹے مولانا مالک کاندھلوی نے مکمل کیے۔

تصورِ نزولِ مسیح کے متعلقات

سطورِ بالا میں نزولِ مسیح کے جملہ دلائل بیان ہو گئے ہیں۔ اِنھی کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے، وہاں ذی حیات ہونے، پھر قیامت کے قریب زمین پر اترنے اور بعض امور انجام دے کر وفات پا جانے کا تصور قائم ہے۔ علماے امت قرآن و حدیث کے مذکورہ نصوص کی بنا پر اِس تصور کو مبنی بر حق قرار دیتے اور اِس کے انکار کا ابطال کرتے ہیں۔ علامہ زاہد الکوثری[40] نے اپنی کتاب ''نظرة عابرة فی مزاعم من ینکر عیسی علیہ السلام قبل الآخرة'' میں نزولِ مسیح کے دلائل درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

فظهر مما سبق ان نصوص القرآن الكريم وحدها تحتم القول برفع عيسى عليه السلام حيًا وبنزوله في آخر الزمان. حيث لا اعتداد باحتمالات خيالية لم تنشاء من دليل.كيف،والاحاديث قد تواترت في ذلك. واستمرت الامة خلفًا عن سلف على الاخذ بها وتدوين

''گذشتہ بحث سے واضح ہے کہ فقط قرآنِ کریم کے نصوص ہی عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے اور آخری زمانے میں نازل ہونے کا قطعیت کے ساتھ اثبات کرتے ہیں۔ اِن کی موجودگی میں خیالی احتمالات، جن کی کوئی دلیل نہ ہو، ان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اِن کا اعتبار بھلا کیسے

---

[40] سلطنت عثمانیہ کے آخری دور کے معروف عالم اور مصنف (1879ء-1952ء)۔

موجبها فی کتب الاعتقاد من قدیم العصور الی الیوم.(106)

ہو سکتا ہے، جب کہ اِس موضوع پر متواتر احادیث موجود ہیں؟ امت نے ہمیشہ ان پر عمل کیا ہے، نسل در نسل ان کو قبول کیا ہے اور قدیم ادوار سے لے کر آج تک عقائد کی کتابوں میں درج کرتی چلی آرہی ہے۔“

یہ اقتباس علما کے عمومی موقف کا خلاصہ ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ جب نزولِ مسیح کے نصوص کا ذکر ہو تو اُن کے ساتھ بعض لوازم اور نتائج بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔ اِن کی نوعیت ضمنی اور اضافی بحثوں کی ہے، جو موقف کی تاکید اور اُس کے بارے میں رفع اعتراضات کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ تاہم، دین کے مجموعی تناظر میں اِن کی خاص اہمیت ہے۔ اِس لیے اِن کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اِس ضمن میں تین نمایاں مباحث درجِ ذیل ہیں۔

1۔ نزولِ مسیح کا عقائد میں شمول

نزولِ مسیح کے تصور کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ گویا علما کے نزدیک یہ توحید، رسالت اور آخرت جیسے عقائد ہی کی طرح ایک عقیدہ ہے، جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایمان رکھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے براہِ راست نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جسے زمانۂ مستقبل میں رونما ہونا ہے۔ چونکہ یہ صحیح اور متواتر احادیث پر مبنی ہے، لہٰذا اِس پر یقین ایمان کا تقاضا اور اِس کا انکار کفر کے مترادف ہے۔

احناف کے مذہبی عقائد کی نمایندہ کتاب ”عقیدۃ الطحاویہ“[41] میں لکھا ہے:

---

[41] یہ امام ابو جعفر طحاوی کی تصنیف ہے۔

ونؤمن بأشراط الساعة منها: خروج الدجال ونزول عیسى ابن مریم علیه السلام من السماء.
(59/1)

"ہم قیامت کی نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ دجال کے خروج اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے آسمان سے نزول پر ایمان بھی اِنھی میں سے ہے۔"

امام ابو حنیفہ سے منسوب کتاب "الفقہ الاکبر" میں بیان ہوا ہے:

خروج الدجال ویأجوج ومأجوج وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسى علیه السلام من السماء وسائر علامات یوم القیامة علی ما وردت به الاخبار الصحیحة حق کائن.
(72)

"دجال اور یاجوج و ماجوج کا خروج، سورج کا مغرب سے طلوع، عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول اور صحیح روایات میں مذکور تمام علاماتِ قیامت برحق ہیں اور واقع ہونے والی ہیں۔"

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

قال قاضی رحمه الله: نزول عیسى علیه السلام وقتله الدجال حق وصحیح عند أهل السنة، للاحادیث الصحیحة فی ذلك. ولیس فی العقل ولا فی الشرع ما یبطله فوجب إثباته.
(شرح النووی علی مسلم 7/599)

"قاضی عیاض رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: اہل سنت کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا اور ان کا دجال کو قتل کرنا برحق اور درست ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحیح احادیث پر مبنی ہے۔ عقل و شرع میں اِس کے ابطال کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا اِس کو ماننا واجب ہے۔"

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

إما نفی نزول عیسى، أو نفی النبوة عنه وکلاهما کفر؟

"جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یا اُن کی نبوت کے انکار کا

تعلق ہے تو یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔" (الحاوی للفتاوی 2/201)

2۔نزولِ مسیح کے تصور پر امت کا اجماع

علما کے نزدیک نزولِ مسیح کے تصور پر امت کے اہل علم میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اُن تصورات میں شامل ہے، جن پر امت کا اجماع ہے:

امام ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر "جامع البیان" میں لکھا ہے:

والاجماع علی انه حی فی السماء وینزل ویقتل الدجال ویؤید الدین. (2/52)

"امت کا اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں۔ وہ (آسمان سے) نازل ہوں گے، دجال کو قتل کریں گے اور دین کی تائید کریں گے۔"

امام ابن عطیہ "البحر المحیط" میں لکھتے ہیں:

وأجمعت الامة علی ما تضمنه الحدیث المتواتر من: أن عیسی فی السماء حی، وأنه ینزل فی آخر الزمان،فیقتل الخنزیر. (2/360)

"حدیثِ متواتر کی بنا پر تمام امت کا اِس پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان میں زندہ موجود ہیں۔ وہ آخری زمانے میں نازل ہوں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔"

امام اشعری لکھتے ہیں:

وأجمعت الامة علی أن اللہ سبحانه رفع عیسی صلی اللہ علیه وسلم إلی السماء.

(الابانہ عن اصول الدیانہ 1/115)

"امت کا اِس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھا لیا تھا۔"

"تلخیص الحبیر" میں ہے:

فاتفق أصحاب الاخبار والتفسير على أنه رفع ببدنه حيًا. (462/3)

”مورخین اور مفسرین اِس بات پر متفق ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے جسم کے ساتھ آسمان کی طرف زندہ اٹھائے گئے۔“

حنابلہ کے معروف عالم امام شمس الدین سفارینی[42] لکھتے ہیں:

واما الاجماع فقد اجتمعت الامة على نزوله ولم يخالف فيه احد من اهل الشريعة وانما انكر ذلك الفلاسفة والملاحدة مما لا يعتد بخلافة وقد انعقد اجماع الامة على انه ينزل ويحكم بهذه الشريعة المحمديه. (شرح عقیدۂ سفارینی 2/90)

”جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا معاملہ ہے تو اِس پر امت کا اجماع ہے۔ اہل شریعت میں سے کوئی اِس کا مخالف نہیں ہے۔ اہل فلسفہ اور ملحدین کے علاوہ کسی نے اِس کا انکار نہیں کیا۔ اِن کا اختلاف (دین میں) قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ اجماعِ امت ہے کہ مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اِسی شریعت کا حکم دیں گے۔“

3۔ نزولِ مسیح اور ختم نبوت

حضرت مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہو گی، اِس لیے نزولِ مسیح کا تصور بہ ظاہر ختم نبوت کے تصور سے معارض محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزولِ مسیح کو ماننے کی صورت

---

42 فلسطین کے علاقے سفارین سے تعلق رکھنے والے عالم اور مصنف (1701ء-1774ء)۔

میں قرآن وحدیث کے صریح نصوص—— مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ”محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔“[43] اور وأنا خاتم النبيين، وإنه لا نبي بعدي ”میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا“[44]——کی کیا توجیہ ہو گی؟

علما کے نزدیک اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ نزول کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نہ وحی نازل ہو گی اور نہ وہ اپنی شریعت، یعنی شریعتِ موسوی کے پیرو ہوں گے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے دنیا میں آئیں گے اور آپ ہی کی شریعت کی پیروی کریں گے۔ اُن کی آمد چند خاص فرائض کی انجام دہی کے لیے ہو گی۔ اُنھیں انجام دے کر وہ وفات پا جائیں گے۔ استدلال یہ ہے کہ چونکہ وہ رسالت کے دو بنیادی اوصاف——وحی اور اجراے شریعت——سے متصف نہیں ہوں گے، اِس لیے اُن کی آمد ختم نبوت کے واقعے کو تبدیل نہیں کرے گی۔

علامہ تفتازانی[45] ”شرح عقائد نسفی“ میں لکھتے ہیں:

ثبت انه اٰخر الانبیاء ... فان قیل: قد روی فی الحدیث نزول عیسی علیه السلام بعده، قلنا: نعم لکنه یتابع محمد علیه السلام لان شریعة قد نسخت لا یکون الیه وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة

”یہ ثابت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں... اگر کہا جائے کہ آپ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں، آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے،

---

[43] الاحزاب 33:40۔

[44] ترمذی، رقم 2219۔

[45] سعد الدین تفتازانی، 722ھ-792ھ۔

رسول اللّٰہ علیہ السلام.(135)

کیونکہ اُن کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے، اِس لیے، نہ اُن کی طرف وحی ہو گی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طور پر اپنے امور انجام دیں گے۔"

علامہ آلوسی[46] نے اپنی تفسیر "روح المعانی" میں لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو اُن کی نبوت اُن سے منفک نہیں ہو گی۔ تاہم وہ اصول و فروع، دونوں میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کے پابند ہوں گے:

ثم انه علیه السلام حین ینزل باق علی نبوته السابقة لم یعزل عنها بحال لکنه لا یتعبد بها لنسخها فی حقه وحق غیره وتکلیفه باحکام هذا الشریعة اصلاً وفرعًا فلا یکون الیه علیه السلام وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم وحاکمًا من حکام ملته بین امته.

(290/22)

"پھر عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، اُس سے معزول نہیں ہوں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شریعت اُن کے لیے اور باقی لوگوں کے لیے منسوخ ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب وہ اصول اور فروع میں اِسی شریعت کی پیروی کے مکلف ہوں گے۔ لہٰذا اُن پر نہ وحی آئے گی اور نہ اُنھیں احکام مقرر کرنے کا اختیار ہو گا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپ کی امت میں ملتِ

---

[46] سید محمود بن عبد اللہ آلوسی بغدادی، 1217ھ-1270ھ۔

محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم
کی حیثیت سے کام کریں گے۔"

امام رازی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ لٰہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی آخر الزماں ہی کے تابع ہوں گے۔ "التفسیر الکبیر" میں ہے:

انتهاء الانبياء الى مبعث محمد صلى اللّٰه عليه وسلم فعند مبعثه انتهت تلك المدة، فلا يبعد ان يصير (اى عيسى ابن مريم) بعد نزوله تبعًا لمحمد عليه الصلاة والسلام.(11/83)

"انبیا کا دور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ و سلم مبعوث ہو گئے تو انبیا کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ آپ، (یعنی حضرت عیسیٰ ابنِ مریم) اپنے نزول کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔"

مولانا مودودی نے "تفہیم القرآن" میں سلف کے اِسی موقف کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کا یہ دوبارہ نزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہو گا۔ نہ اُن پر وحی نازل ہو گی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدی میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ اُن کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آ کر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے۔

وہ صرف ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہو گا کہ دجال کے فتنے کا استیصال کر دیں۔ اِس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان اُن کا نزول ہو گا، اُنھیں اِس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسیٰ ابنِ مریم ہی ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آ کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں

کا امام اُس وقت ہو گا، اُسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور جو بھی اُس وقت مسلمانوں کا امیر ہو گا، اُسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اِس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی گنجایش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اُس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آ کر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اِس امر کا اعلان ہو گا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اِس بنا پر اُن کی آمد سے مہرِ نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہو گا۔

اُن کا آنا بلا تشبیہ اُسی نوعیت کا ہو گا، جیسے ایک صدرِ ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔...

اِسی طرح اُن کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہو گا۔ اُن کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اُن کی اِس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری امت ابتدا سے اُن کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہو گی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے، جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختم نبوت کے خلاف ہے، نہ اُس وقت ہو گی۔" (4/163-164)

باب سوم

نزولِ مسیح ــــ غامدی صاحب کے اشکالات

جناب جاوید احمد غامدی نزولِ مسیح کے تصور کو محل نظر سمجھتے ہیں۔ اِس کا سبب عقل و نقل کے بعض اشکالات ہیں۔ اِن میں وہ اشکالات نمایاں ہیں، جو نزولِ مسیح کی روایتوں پر قرآنِ مجید کی روشنی میں غور کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اِن کے علاوہ وہ سوالات بھی اہم ہیں، جو روایت و درایت کے مسلمہ اصولوں کے حوالے سے سامنے آتے اور مذکورہ روایتوں کے عمومی مفہوم کو قبول کرنے میں مانع ہیں۔ اول الذکر کو استاذِ گرامی نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ ''روزِ جزا پر ایمان'' کے زیرِ عنوان قیامت کے آثار و علامات کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یاجوج و ماجوج اور مسیح دجال کے خروج کا اثبات کیا ہے، وہاں نزولِ مسیح کے بارے میں اپنے تردد کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

> ''... نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محل نظر ہیں۔
>
> اولاً، اِس لیے کہ مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآن مجید میں کئی پہلوؤں سے زیر بحث آئی ہے۔ اُن کی دعوت اور شخصیت پر قرآن نے جگہ جگہ تبصرہ کیا ہے۔ روز قیامت کی ہلچل بھی قرآن کا خاص موضوع ہے۔ ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اِس واقعے کی طرف کوئی

ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم و عقل اِس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اِسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔

ثانیاً، اِس لیے کہ سورۂ مائدہ میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے، جو قیامت کے دن ہو گا۔ اُس میں اللہ تعالیٰ اُن سے نصاریٰ کی اصل گم راہی کے بارے میں پوچھیں گے کہ کیا تم نے یہ تعلیم اِنھیں دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ اِس کے جواب میں وہ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ میں نے تو اِن سے وہی بات کہی جس کا آپ نے حکم دیا تھا اور جب تک میں اِن کے اندر موجود رہا، اُس وقت تک دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو میں نہیں جانتا کہ اِنھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ہے۔ اِس کے بعد تو آپ ہی اِن کے نگران رہے ہیں۔ اِس میں دیکھ لیجیے، مسیح علیہ السلام اگر ایک مرتبہ پھر دنیا میں آ چکے ہیں تو یہ آخری جملہ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اِس کے بعد تو اُنھیں کہنا چاہیے کہ میں اِن کی گم راہی کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ابھی کچھ دیر پہلے اِنھیں اُس پر متنبہ کر کے آیا ہوں۔...

ثالثاً، اِس لیے کہ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحۂ عمل بیان فرمایا ہے۔ یہ موقع تھا کہ قیامت تک کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بیان کر رہے تھے، جو اُن کے اور اُن کے پیرووں کے ساتھ ہونے والی ہیں تو یہ بھی بیان کر دیتے کہ قیامت سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تجھے دنیا میں بھیجنے والا ہوں، مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ سیدنا مسیح کو آنا ہے تو یہ خاموشی کیوں ہے؟ اِس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔" (182-183)

یہ قرآنِ مجید کی روشنی میں استاذِ گرامی کے اشکالات کا بیان ہے۔ جہاں تک اُن اشکالات کا تعلق ہے، جو روایت و درایت کے اصولِ حدیث کی روشنی میں پیدا ہوتے اور نزولِ مسیح کے تصور پر تردد کا باعث بنتے ہیں تو اُنھیں استاذِ گرامی نے "غامدی صاحب کے فکر پر 23

اعتراضات کے جواب میں” کی ویڈیو سیریز میں “نزولِ مسیح” کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے۔ اِن
دونوں نوعیت کے اشکالات کی تفصیل درج ہے۔

قرآن اور نزولِ مسیح

غامدی صاحب کے اشکالات

قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ 13 مختلف سورتوں میں کئی مقامات پر آپ کا حوالہ مذکور ہے۔ اِن میں آپ کی شخصیت کے متنوع پہلو اور حالاتِ زندگی کے مختلف معاملات زیرِ بحث ہیں۔ آپ کے خاندان کا ذکر ہے، آپ کی والدۂ محترمہ سیدہ مریم علیہا السلام کی مقدس شخصیت کا تعارف ہے، آپ کی پیدایش سے پہلے کے حالات کا بیان ہے، آپ کی خارقِ عادت ولادت کی تفصیل ہے، از ولادت تا رفع الی اللہ پوری زندگی کا خلاصہ ہے، آپ کی دعوت اور اُس پر مخاطبین کے ردِ عمل کی داستان ہے، آپ کے عظیم الشان معجزات کا حوالہ ہے، آپ کی وفات کی خبر ہے، بعد از وفات یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل کی روداد ہے، یہاں تک کہ مستقبل بعید، یعنی قیامت میں اللہ تعالیٰ سے ہونے والا آپ کا وہ مکالمہ بھی درج ہے، جس میں آپ نے دنیا میں اپنے کردار کو بیان کیا ہے۔ یہ تمام معاملات قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، لیکن آپ کی زندگی، بلکہ تاریخ انسانی کا یہ اہم ترین واقعہ —— کہ آپ وفات اور رفع الی اللہ کے صدیوں بعد آسمان سے براہِ راست نازل ہوں گے —— قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اِن میں بعض مقامات مضمون اور اسلوب کے لحاظ سے اِس امر

کے متقاضی ہیں کہ اگر آپ کا نزول ہونا ہے تو وہاں اِس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ مگر ذکر تو کیا، معمولی اشارہ بھی نہیں ہے۔ استاذِ گرامی کے نزدیک قرآن کی یہ خاموشی باعثِ اشکال ہے اور نزولِ مسیح کے تصور پر عدمِ اطمینان کو نمایاں کرتی ہے۔

پہلا اشکال:

قرآن میں بیان کے مواقع کے باوجود نزولِ مسیح کا عدم ذکر

قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق تمام اہم واقعات مذکور ہیں۔ اِن میں پیدایش سے پہلے کے واقعات، پیدایش کے موقع کے واقعات، پیدایش کے بعد کے واقعات، وفات کے موقع کے واقعات، وفات کے بعد کے واقعات اور روزِ قیامت کے واقعات درج ہیں۔ محل نظر ہے کہ یہ واقعات تو مذکور ہوں، مگر اِنھی کے ضمن کا ایک نہایت اہم واقعہ مذکور نہ ہو۔ تفہیم مدعا کے لیے اِس ضمن کے چند نمایندہ مقامات درجِ ذیل ہیں:

i۔ سورۂ آل عمران (3) کی آیات 45 تا 47 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش سے پہلے کے اہم ترین پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے:

- اللہ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو حمل سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدایش کی بشارت دی۔
- اللہ نے اُنھیں اپنے کلمہ، یعنی قول سے تعبیر کیا اور آپ کا نام عیسیٰ رکھا۔
- اللہ نے پیشگی بتایا کہ حضرت مسیح گھوارے میں اپنی نبوت کے بارے میں کلام کریں گے۔
- بڑے ہو کر وہ صالحین میں شمار ہوں گے۔

آیات درجِ ذیل ہیں:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ — ”اِنھیں یاد دلاؤ، جب فرشتوں نے

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ. وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ. قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ.

کہا: اے مریم، اللہ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں صاحب وجاہت اور مقربین میں سے ہو گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی (اپنی نبوت کا) کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔ وہ بولی: پروردگار، میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا، مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا: اِسی طرح اللہ جو چاہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، پھر وہ ہو جاتا ہے۔“

یہاں کلام میں پوری گنجایش ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو نزولِ مسیح کا ذکر فرما دیتے۔ یہ پیدایش سے پہلے کا بیان ہے۔ اِس میں آپ کی خارقِ عادت پیدایش اور دنیا و آخرت میں آپ کی کامیابی کا ذکر ہے۔

ii۔ سورۂ آل عمران (3) کی آیت 59 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اُن کی مثال حضرت آدم کی سی ہے۔ یعنی جس طرح وہ اللہ کے کلمۂ ’کُنْ‘ (ہو جا) سے پیدا ہوئے تھے، اُسی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی پیدا ہوئے ہیں۔[47] اِس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر آدم علیہ السلام اللہ کے حکم پر مٹی سے تخلیق پا کر معبود نہیں بن گئے

---

[47] آلِ عمران (3) کی آیت 48 میں اِس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔

تھے تو سیدنا مسیح اُس کے امر سے پیدا ہو کر کیسے عبادت کے لائق ہو سکتے ہیں! ارشاد ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ.

”اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اُسے مٹی سے بنایا، پھر اُس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔“

یہ مقام اصل میں اُس خلقی استثنا کا بیان ہے، جو تاریخ انسانی میں دو شخصیات حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو حاصل ہوا تھا۔ دونوں اللہ کے براہِ راست حکم سے پیدا ہوئے تھے۔ آدم علیہ السلام مٹی کو کلمۂ 'کُنۡ' (ہو جا) کہنے سے وجود میں آئے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم پر اِس کلمے کے القا سے تولد ہوئے تھے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اِس استثنائی واقعے کو بیان کیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اِسی سطح کے اُس استثنائی واقعے کو بیان نہیں فرمایا، جس کے مطابق سیدنا مسیح تمام بنی نوعِ انسان میں واحد استثنا کے طور پر آسمانوں سے براہِ راست نازل ہوں گے؟

iii۔ سورۂ آلِ عمران (3) کی آیات 48 تا 51 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش سے پہلے آپ کے کارِ دعوت و رسالت کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں آپ کو عطا کیے گئے معجزات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بتایا ہے:

- اللہ اُنھیں قانون و حکمت سکھائیں گے، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دیں گے۔
- اُنھیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا جائے گا۔
- وہ مٹی سے پرندے کی مورت بنا کر اُس میں پھونکیں گے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جائے گا۔
- وہ پیدایشی اندھوں کو بینا کریں گے اور کوڑھ کے لاعلاج مرض میں مبتلا لوگوں کو شفایاب کریں گے۔
- وہ مردہ انسانوں کو زندہ کریں گے۔

- وہ تورات کی تصدیق کریں گے۔
- وہ اُن چیزوں کو حلال ٹھہرائیں گے، جو حرام کی گئی ہیں۔

آیات درجِ ذیل ہیں:

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ. وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ. اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ.

”اور اللہ اُسے قانون اور حکمت سکھائے گا، یعنی تورات وانجیل کی تعلیم دے گا۔ اور اُس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ (چنانچہ یہی ہوا اور اُس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں، پھر میں اُس میں پھونکتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ فی الواقع پرندہ بن جاتی ہے؛ اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں؛ اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں؛ اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں، جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ اِس میں تمھارے لیے یقیناً ایک بڑی نشانی ہے، اگر تم ماننے والے ہو۔ اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو مجھ سے پہلے آ چکی ہے اور اِس لیے آیا

ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن
چیزوں کو حلال ٹھیراؤں جو تم پر حرام
کر دی گئی ہیں، اور (دیکھو) میں
تمھارے پروردگار کی طرف سے
تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔
سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یقیناً
اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی،
لٰہذا تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی
راہ ہے۔"

یہاں وہ تمام چیزیں مذکور ہیں، جو حضرت مسیح علیہ السلام کو من جانبِ اللہ انجام دینی ہیں۔ یعنی یہ اللہ کی جانب سے آپ کے فرائض اور آپ کے دنیوی کردار کے اجزا ہیں۔ نزولِ مسیح کا واقعہ بھی من جانبِ اللہ ہے اور قیامت سے پہلے اللہ کے بعض اہم فیصلوں کا نفاذ ہے۔ اِس فہرست میں اِس کا شامل نہ ہونا بھی اشکال پیدا کرتا ہے۔

iv۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے بن باپ کے پیدا ہونا خارقِ عادت واقعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست حکم سے عمل میں آیا ہے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مریم اور ابنِ مریم، دونوں کو آیت قرار دیا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد فرمایا ہے:

وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً.... (50:23)	"اور مریم کے بیٹے اور اُس کی ماں کو بھی ہم نے اِسی طرح ایک عظیم نشانی بنایا...۔"

سورۂ انبیاء میں اِن دونوں ہستیوں کو 'اٰيَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ' (دنیا والوں کے لیے نشانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّتِيۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِيۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَ جَعَلۡنٰهَا وَ ابۡنَهَاۤ اٰيَةً	"اور اُس خاتون پر بھی جس نے اپنا دامن پاک رکھا تو ہم نے اُس کے اندر

لِّلۡعٰلَمِیۡنَ.(91:21)

اپنی روح پھونک دی اور اُس کو اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔''

چنانچہ سورۂ مریم میں واضح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی بن باپ کے پیدایش ایک خارقِ عادت واقعہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی کے طور پر ظاہر کیا تھا۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدایش کے عام قانون سے ہٹ کر اپنا حکم براہِ راست نازل کیا اور اپنے کلمۂ 'کن' سے بطن مادر میں مولود کا استقرار کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی۔ یہ نشانی رہتی دنیا تک کے لیے تخلیق انسانی اور اُس کے اعادے کی دلیل کے طور پر نمایاں رہے گی۔ فرمایا ہے:

وَ اذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مَرۡیَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَہۡلِہَا مَکَانًا شَرۡقِیًّا. فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ حِجَابًا ۟ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِیًّا. قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا. قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ٭ۖ لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا. قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّ لَمۡ اَکُ بَغِیًّا. قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجۡعَلَہٗۤ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَۃً مِّنَّا ۚ وَ کَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا.(21-16:19)

''(اب) اِس کتاب میں مریم کا ذکر کرو، جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر (بیت المقدس کے) مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اور اپنے آپ کو اُن سے پردے میں کر لیا تھا۔ پھر ہم نے اُس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ اُس کے سامنے ایک پورے آدمی کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ مریم (نے اُسے دیکھا تو) بول اٹھی کہ میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تم اُس سے ڈرنے والے ہو۔ اُس نے کہا: میں تمھارے پروردگار ہی کا فرستادہ ہوں اور اِس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ مریم

نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، نہ
مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ
میں کبھی بدکار رہی ہوں! اُس نے
کہا: اِسی طرح ہو گا۔ تمھارا پروردگار
فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے بہت آسان
ہے۔ ہم یہ اِس لیے کریں گے کہ وہ
ہمارا پیغمبر ہو اور اِس لیے کہ ہم اُس کو
لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی
طرف سے رحمت بنائیں۔ اور یہ بات
طے کر دی گئی ہے۔"

درجِ بالا مقام سے واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آیۃٌ من آیاتِ اللہ تھے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے اوصاف کو اللہ نے لوگوں کے لیے نشانیاں بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ کے آیتِ الٰہی ہونے کے جملہ پہلوؤں کو اگر قرآن نے بیان کیا ہے تو آپ کے نزول کے غیر معمولی پہلو کو کیوں بیان نہیں کیا، دراں حالیکہ ایک لحاظ سے یہ آپ کی پیدایش سے بھی بڑی آیت ہے۔ اُسے تو بہتان طرازی سے جھٹلایا جا سکتا ہے اور جھٹلایا بھی گیا ہے، مگر زمانۂ قدیم کے ایک انسان کا دو ہزار سال بعد لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے براہِ راست نزول ایسا واقعہ ہے، جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح کے اللہ کی آیت ہونے کی عظیم شہادت کا باقی شواہد کے ساتھ مذکور ہونا عقلی اقتضا ہے۔ یہ اگر مذکور نہ ہو تو اِس کے وقوع پر اشکال کا وارد ہونا بھی عقل کا تقاضا ہے۔

v۔ سورۂ مریم (19) کی آیات 22 تا 33 میں سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت اور آپ کے گہوارے میں کلام کرنے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ دونوں آپ کی زندگی کے نہایت غیر معمولی اور انسانی تاریخ کے بالکل منفرد واقعات تھے۔ سورۂ مریم میں بیان ہوا ہے کہ اللہ

کے حکم سے سیدہ مریم کو حمل ٹھہرا اور وہ اِس کے ساتھ اپنے علاقے سے دور چلی گئیں۔ پھر جب وضع حمل کا موقع پیدا ہوا تو اُس وقت اللہ کا فرشتہ آیا، جس نے اُنھیں تسلی دی اور اُن کے لیے چشمہ جاری کیا۔ پھر اُنھیں ہدایت کی کہ وہ نومولود کو لے کر اپنی قوم میں واپس جائیں۔ وہ اگر کوئی سوال یا اعتراض کریں تو اشارے سے بتادیں کہ اُنھوں نے چپ رہنے کا روزہ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ واپس گئیں۔ بچے کو ساتھ دیکھ کر لوگوں نے اُن کی پاک دامنی پر تہمت لگانی شروع کی تو اُنھوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اُس سے کیسے پوچھیں، جو نومولود ہے اور بولنے کی عمر کو نہیں پہنچا۔ اِس پر بچے نے بولنا شروع کر دیا۔

بچے نے بتایا:

- وہ اللہ کا بندہ ہے۔
- اللہ نے اُسے کتاب اور نبوت عطا فرمائی ہے۔
- اِس بنا پر اُسے خیر و برکت کا سرچشمہ بنایا ہے۔
- اللہ نے اُسے اپنی والدہ کا فرماں بردار بنایا ہے۔
- اللہ نے اُسے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔
- اللہ نے اُسے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ تا زندگی:

ا۔ نماز پڑھتا رہے۔

ب۔ زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔

- اللہ نے اُس کی زندگی اور موت کے اِن تین موقعوں پر سلامتی کی بشارت دی ہے:

ا۔ جس دن وہ پیدا ہوا۔

ب۔ جس دن وہ مر جائے گا۔

ج۔ جس دن (روزِ قیامت) وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔

قرآنِ مجید کا بیان ہے:

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا. فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا. فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا. وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا. فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا. فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا. يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا. فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا. قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا. وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ ۫ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا. وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا.

(مریم 19: 22-33)

”سو مریم اُس بچے سے حاملہ ہو گئی اور (بیت المقدس سے نکل کر) اُس حمل کو لیے ہوئے، سب سے الگ ایک دور کی جگہ چلی گئی۔ پھر (وہ وقت بھی آ گیا کہ) زچگی کی تکلیف اُسے کھجور کے تنے کے پاس لے آئی۔ (اُس وقت سخت بے بسی کی حالت میں) اُس نے کہا: اے کاش، میں اِس سے پہلے ہی مر جاتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ اِس پر مریم کے نیچے سے فرشتے نے اُس کو پکار کر کہا: غم نہ کرو، تمھارے پروردگار نے تمھارے پائیں سے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے۔ اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، تمھارے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ سو کھاؤ پیو اور (بچے کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر کوئی آدمی دیکھو (کہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے) تو اشارے سے کہہ دو کہ میں نے خداے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مان رکھی ہے، اِس لیے آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہ کروں گی۔ اِس کے بعد وہ بچے کو

گود میں لیے ہوئے اپنے لوگوں کے
پاس آئی۔ اُنھوں نے (دیکھا تو) کہا:
مریم، تم نے یہ بڑی سنگین حرکت کر
ڈالی ہے۔ اے ہارون کی بہن، نہ
تمھارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ
تمھاری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔
اُس نے جواب میں بچے کی طرف
اشارہ کیا (کہ وہی بتائے گا)۔ لوگوں
نے کہا: ہم اُس سے کیا بات کریں، جو
گود میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟ بچہ بول
اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے
کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا۔ اور
جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے سرچشمۂ
خیر وبرکت ٹھیرایا ہے۔ اُس نے مجھے
ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک میں
زندہ رہوں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام
کروں۔ اور مجھے اپنی ماں کا فرماں بردار
بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں
بنایا۔ اور مجھ پر سلامتی (کی بشارت) ہے
جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن
مروں گا اور جس دن زندہ کر کے
اٹھایا جاؤں گا۔"

سورۂ مریم کی اِن آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گھوارے میں گفتگو کا آخری حصہ

موضوعِ زیر بحث کے لحاظ سے نہایت معنی خیز ہے۔ قرآنِ مجید سے واضح ہے کہ زمین پر حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی ذریت — یعنی تمام بنی نوعِ انسان — کا ہر فرد تین مراحل سے گزرے گا: ایک پیدایش، دوسرے موت اور تیسرے بعث بعد الموت، یعنی قیامت۔ اِس معاملے میں ایک استثنا کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کر دیا ہے۔ یہ سیدنا مسیح کے مردوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ہے۔ تاہم، اِس کی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اگر نزولِ مسیح کی روایات کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درست ہے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو اِس معاملے میں پوری انسانیت کے اندر ایک نمایاں استثنا حاصل ہے۔ یعنی اُن کے لیے عام قاعدے کے مطابق تین مرحلے نہیں، بلکہ اُس سے ہٹ کر یہ پانچ مرحلے ہیں:

1۔ پیدایش،

2۔ وفات اور رفع الی السماء، یعنی وفات دے کر آپ کے جسم کو آسمان کی طرف اٹھا لینا،

3۔ وفات کا خاتمہ اور نزول الی الارض، یعنی وفات کی کیفیت کو ختم کر کے زمین کی طرف نزول،

4۔ موت،

5۔ بعث بعد الموت، یعنی قیامت کے موقع پر زندہ کر کے دوبارہ اٹھانا۔

تاریخ انسانی کا یہ نمایاں استثنا اگر قطعی الثبوت خبر کے بجائے ظنی الثبوت خبر کے ذریعے سے بیان کیا جائے تو اِس کا محل نظر ہونا ناقابلِ فہم نہیں ہے۔

مزید برآں، یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب گہوارے میں کلام فرمایا اور پیدایش سے لے کر قیامت تک زندگی کے تمام مرحلوں کو بیان کر دیا تو اُس موقع پر آپ نے دنیا میں اپنے نزول کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ موقع بیان اور شانِ کلام کا لازمی تقاضا تھا کہ اگر یہ نزول ہونا ہے تو اِسے اِس موقع پر بہ صراحت بیان کر دیا جائے۔

vi۔ سورۂ نساء (4) کی آیات 155 تا 158 میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اُن جرائم کو

بیان کیا ہے، جن کی بہ دولت وہ اللہ کی لعنت کے مستحق ٹھہرے۔ اِس سلسلے میں پہلا جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ سے کیے گئے عہد کو توڑا۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ کی آیتوں کو ماننے سے انکار کیا۔ تیسرا جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کیا۔ چوتھا جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے کفر اور نافرمانی کی روش اختیار کی۔ پانچواں جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے سیدہ مریم پر بہتان طرازی کی۔ چھٹا جرم یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ جھوٹا دعویٰ کیا کہ اُنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔ اِسی چھٹے جرم پر قرآن نے مزید بات کی ہے اور اُن کے دعوے کی صریح طور پر تردید کی ہے۔ اِس پہلو سے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے:

- بنی اسرائیل مسیح علیہ السلام کو نہ قتل کر سکے اور نہ صلیب دے سکے۔
- اِس موقع پر اللہ نے اُنھیں اپنی طرف اٹھا لیا۔
- بنی اسرائیل کے لیے معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔

ارشاد ہے:

وَقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا. بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا.

(النسا4:157-158)

”اور اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے (ہم نے اِن پر لعنت کر دی)، —— دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں، وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے

ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں
کیا۔ بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھالیا
تھااور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت
والا ہے۔"

یہاں یہود کے اُس دعوے کی تردید مقصود ہے کہ وہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اِس تردید کے لیے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کو بیان کیا گیا ہے تو اُن کے نزول کا ذکر بھی بر محل تھا۔ یعنی یہ بتایا جانا موقع کلام کے مطابق تھا کہ تمھارا یہ دعویٰ باطل ہے کہ تم حضرت مسیح کو قتل کر پائے ہو، تم اُنھیں قتل نہیں کر پائے، بلکہ اللہ نے اُنھیں اٹھالیا ہے اور قیامت سے پہلے وہ اُنھیں واپس اتارے گا اور وہ تمھارے ایک ایک فرد کو قتل کر کے زمین کو تمھارے وجود سے پاک کر دیں گے۔

دوسرا اشکال:

قیامت کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور حضرت مسیح کا مکالمہ

سورۂ مائدہ (5) کی آیات 116 تا 119 میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہونے والی گفتگو نقل ہوئی ہے۔ یعنی وہ مستقبل میں رونما ہونے والا ایک واقعہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان فرما دیا ہے۔

اِس میں بیان ہوا ہے:

- اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم کے سامنے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اللہ کے سوا آپ کو اور آپ کی والدہ کو معبود بنالیں؟
- عیسیٰ علیہ السلام جواب میں کہیں گے کہ میرے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ میں

لوگوں سے ایسی بات کہوں، جس کا مجھے حق ہی حاصل نہیں ہے۔

- وہ مزید کہیں گے کہ اگر میں نے اِس طرح کی کوئی بات کہی ہوتی یا میرے دل میں ایسی کوئی بات ہوتی تو آپ اِس سے ضرور آگاہ ہوتے۔ میں نے تو اُن سے بس وہی بات کی تھی، جس کا آپ نے حکم فرمایا تھا۔
- آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے اُن سے کہا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تم لوگوں کا بھی رب ہے۔
- پھر وہ کہیں گے کہ:

ا۔ میں جب تک اُن کے اندر موجود رہا، اُن کی نگرانی کرتا رہا۔

ب۔ پھر آپ نے مجھے وفات دے دی اور میں اُن کی نگرانی پر مامور نہیں رہا۔

ج۔ وفات کے بعد سے آج یوم قیامت تک آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں۔

د۔ اب یہ آپ ہی کا فیصلہ ہے کہ اُن کے جرم کی اُنھیں سزا دیں یا اُنھیں معاف فرما دیں۔

- حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اِس وضاحت کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے:

ا۔ آج کا دن وہ دن ہے، جس میں سچائی ہی کام آئے گی۔ دنیا میں سچ پر کھڑے ہونے والوں کے لیے آج جنت کی نعمت ہے۔

ب۔ اُن کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

آیات درجِ ذیل ہیں:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ	”(اللہ کی گواہی جن لوگوں نے چھپائی ہے، وہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب یہ باتیں ہوں گی) اور یہ بھی کہ جب (اِنھیں یاد دلا کر) اللہ پوچھے گا:

اِنۡ کُنۡتُ قُلۡتُہٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَہٗ ؕ تَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِیۡ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ. مَا قُلۡتُ لَہُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِہٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ۚ وَ کُنۡتُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡہِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ. اِنۡ تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَہُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ. قَالَ اللّٰہُ ہٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُہُمۡ ؕ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ.

اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا تم مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو؟ وہ عرض کرے گا: سبحان اللہ، یہ کس طرح روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ کے علم میں ہوتی، (اِس لیے کہ) آپ جانتے ہیں، جو کچھ میرے دل میں ہے اور آپ کے دل کی باتیں میں نہیں جانتا۔ تمام چھپی ہوئی باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔ میں نے تو اُن سے وہی بات کہی تھی، جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ میں اُن پر نگران رہا، جب تک میں اُن کے درمیان تھا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں۔ اب اگر آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ ہی زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔ اللہ فرمائے گا: یہ وہ دن ہے، جس

میں سچوں کی سچائی اُن کے کام آئے
گی۔ اُن کے لیے باغ ہوں گے، جن کے
نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ
ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا
اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی
کامیابی ہے۔"

سورۂ مائدہ کی اِن آیات میں 'وَکُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ' (میں اُن پر نگران رہا، جب تک میں اُن کے درمیان تھا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں) کے الفاظ موضوعِ زیرِ بحث کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔ اِن کا مدعا و مفہوم نزولِ مسیح کے تصور کی نفی پر دلالت کر رہا ہے۔ اِن سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

اولاً، یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و ممات کے تین ادوار مذکور ہیں:

i۔ پیدایش سے وفات تک کا دور۔ 'مَا دُمْتُ فِيْهِمْ' (جب تک میں اِن میں موجود رہا) کے الفاظ سے یہ زمانہ متعین ہوتا ہے۔

ii۔ وفات سے قیامت تک کا دور۔ 'فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ' (پھر جب آپ نے مجھے وفات دی) اور 'هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ' (یہ وہ دن ہے، جس میں سچوں کی سچائی اُن کے کام آئے گی) کے الفاظ سے یوم وفات اور یوم قیامت کا زمانہ متعین ہوتا ہے۔

iii۔ قیامت اور آخرت کا دور۔ 'هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ط لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا' (یہ وہ دن ہے، جس میں سچوں کی سچائی اُن کے کام آئے گی۔ اُن کے لیے باغ ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) کے الفاظ سے قیامت اور آخرت کا دور متعین ہوتا ہے۔

آیات سے واضح ہے کہ اِن میں مذکور تینوں ادوار کے مابین کامل اتصال پایا جاتا ہے۔

کلام کی ترتیبِ بیان اِس اتصال پر شاہد ہے۔ اِس کا مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و ممات کے حوالے سے تین ہی ادوار پائے جاتے ہیں۔ اِن میں اگر کوئی چوتھا دور موجود ہوتا تو یا وہ یہاں مذکور ہوتا یا پھر اِن تین ادوار میں اتصال نہ پایا جاتا۔

اِس دلیل کو قرآنِ مجید ہی کے ایک مقام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سورۂ کہف (18) میں بیان ہوا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا. اِذۡ اَوَى الۡفِتۡيَةُ اِلَى الۡكَهۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا. فَضَرَبۡنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمۡ فِى الۡكَهۡفِ سِنِيۡنَ عَدَدًا. ثُمَّ بَعَثۡنٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ اَىُّ الۡحِزۡبَيۡنِ اَحۡصٰى لِمَا لَبِثُوۡۤا اَمَدًا. (9-12)

”کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے؟ اُس وقت، جب اُن نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر (اپنے پروردگار سے) دعا کی کہ اے ہمارے رب، ہم کو تو خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اِس معاملے میں تو ہمارے لیے رہنمائی کا سامان کر دے۔ اِس پر کئی برس کے لیے ہم نے اُس غار میں اُن کے کانوں پر تھپک دیا۔ پھر ہم نے اُن کو اٹھایا تاکہ دیکھیں کہ دونوں گروہوں میں سے کس نے اُن کے قیام کی مدت ٹھیک شمار کی ہے؟“

اِن آیات سے اصحابِ کہف کی زندگی کے تین ادوار متعین ہوتے ہیں: ایک وہ دور جب اُنھوں نے ابھی غار میں پناہ نہیں لی تھی، دوسرا وہ دور جب اُنھوں نے غار میں پناہ لی اور اللہ نے اُنھیں سلا دیا اور تیسرا وہ دور جب وہ نیند سے بیدار ہو کر غار سے باہر آئے۔ کلام نہایت صریح ہے کہ اِس میں کسی چوتھے دور کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ سونے کے بعد ایک دفعہ نہیں، بلکہ دو دفعہ بیدار ہو کر غار سے باہر نکلے تھے تو یہ کلام سے

تجاوز ہو گا، جو معنویت سے محروم ہو گا۔

ثانیاً، 'فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ' (پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں) کے الفاظ سے مترشح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام وفات (اور رفع الی اللہ) کے بعد قیامت تک اپنے متبعین کے معاملات سے بے خبر تھے۔ یعنی اُنھوں نے پروردگار کی خدمت میں یہ وضاحت پیش کی ہے کہ وفات سے پہلے تو میں اُن کا نگران تھا، مگر وفات کے بعد میں اُن کا نگران نہیں رہا، آپ خود اُن کے نگران ہو گئے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے جو بھی خلاف ورزیاں کی ہیں، اُنھیں آپ ہی جانتے ہیں، میں اُن سے واقف نہیں ہوں۔ نزولِ مسیح کے وقوع کی صورت میں عیسیٰ علیہ السلام کی یہ بات حسبِ حال نہیں رہتی۔ پھر اُنھیں بتانا چاہیے کہ جب آپ نے مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجا تو میں اُن کی تمام گم راہیوں سے آگاہ ہو گیا تھا۔[48]

تیسرا اشکال:

حضرت مسیح کے مکمل لائحۂ عمل کا اعلان اور نزول کا عدم ذکر

سورۂ آل عمران (3) کی آیت 55 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین کے بارے میں قیامت تک کا پروگرام بیان ہوا ہے۔ اِس میں درجِ ذیل باتیں مذکور ہیں:

- اللہ کی طرف سے آپ کو وفات دی جائے گی۔

---

[48] واضح رہے کہ مسیح علیہ السلام کے متبعین میں آپ کی الوہیت کا تصور آپ کی وفات کے بہت بعد بہ تدریج پیدا ہوا تھا۔ ''انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا'' کے محققین کی تحقیق کے مطابق 325 عیسوی میں اِس تصور کو سرکاری طور پر ایک عقیدے کی حیثیت سے قبول کیا گیا۔ اِس سے پہلے وہ آپ کو انسان اور اللہ کا بندہ اور رسول سمجھتے تھے۔ یہی معاملہ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کے تصور کا ہے۔

- پھر اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے اور اِس طرح حضرت مسیح کو اُن کے منکروں سے پاک کریں گے۔
- حضرت مسیح کے متبعین (عیسائیوں) کو قیامت تک آپ کے منکروں (یہود) پر غالب رکھیں گے۔
- پھر قیامت کے موقع پر یہود و نصاریٰ اور دیگر تمام اقوام اللہ کی طرف لوٹیں گی۔
- اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اختلافات کا فیصلہ فرمائیں گے۔

ارشاد ہے:

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ فَوۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ فِيۡمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ.

”اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کردوں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

اگر عیسیٰ علیہ السلام کو رفع الی اللہ کے بعد ایک دفعہ پھر دنیا میں آکر کوئی کردار ادا کرنا ہے تو اِس لائحۂ عمل میں اُس کا ذکر نہ ہونا محل نظر ہے۔ اِس صورت میں لائحۂ عمل کی ترتیب ممکنہ طور پر اِس طرح ہوسکتی تھی:

- اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وفات دیں گے۔

- پھر اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے۔
- پھر ایک مدت کے بعد آپ کو آسمان سے نازل کریں گے۔
- آپ دجال کو قتل کریں گے اور پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ قائم کریں گے۔
- پھر آپ کو موت دی جائے گی۔
- پھر قیامت کے موقع پر آپ اور یہود و نصاریٰ اور دیگر تمام اقوام اللہ کی طرف لوٹیں گی۔
- اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اختلافات کا فیصلہ فرمائیں گے۔

احادیث اور نزولِ مسیح

غامدی صاحب کے اشکالات

ذخیرۂ احادیث میں نزولِ مسیح کی روایات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ واقعۂ نزولِ مسیح کی نوعیت کیا ہے۔

اِس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ نہایت متعین، محسوس اور مشہود واقعہ ہے۔ اپنے اظہار اور اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ عصا کے سانپ بننے، بارہ چشمے پھوٹنے، دریا میں راستہ بننے، بن باپ کے پیدا ہونے، گہوارے میں کلام کرنے، تین سو سال تک سوتے رہنے کے بعد جاگ اٹھنے اور چاند کے شق ہو جانے سے بڑا واقعہ ہے۔[49] اِس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ واقعات کے بارے میں کوئی بے سروپا تاویل پیش کر کے الجھاؤ پیدا کیا جا سکتا اور کم نظر لوگوں کو اِن کی تردید پر آمادہ کیا جا سکتا ہے،[50] مگر یہ واقعہ اِس قدر مرئی، مجسم اور دیرپا ہے کہ اِس کی تردید کے لیے کوئی

---

[49] یہ قرآنِ مجید میں مذکور اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نشانیاں ہیں۔ اِن میں سے بعض اللہ کی طرف سے براہِ راست اور بعض انبیا کے توسط سے ظاہر ہوئیں۔

[50] جیسا کہ مثال کے طور پر شق قمر کے بارے میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اِس کا مشاہدہ ساری دنیا میں

کم زور تاویل بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ حد درجہ خارقِ عادت اور نہایت محیر العقول ہے۔ ایک شخصیت کا دو ہزار سال تک دنیا سے اوجھل رہنا اور پھر برسرِعام آسمان سے نازل ہونا ایسا مظاہرہ ہے، جو انسانی تاریخ میں نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ ظہور کے بعد دوبارہ کبھی ہو گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کسی عام انسان کا نزول نہیں ہے، بلکہ اللہ کے نبی کا نزول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس کا تعلق اللہ کی قدرت و مشیت کے عام معاملات سے نہیں، نبوت و رسالت کے خصوصی معاملے سے ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ قیامت کی نشانیوں میں سب سے بڑی نشانی ہے۔ احادیث میں قربِ قیامت کی متعدد نشانیاں مذکور ہیں۔ اِن میں دھوئیں کا نکلنا، مشرق و مغرب میں زمین کا دھنس جانا، زمین کے جانور کا پیدا ہونا، آگ کا لوگوں کو ہانکنا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا ظاہر ہونا، یاجوج وماجوج کا خروج کرنا اور اِس نوعیت کی دیگر علامتیں شامل ہیں۔ اِس فہرست پر ایک نظر ڈالنے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ نزولِ مسیح کی علامت اِن میں سب سے نمایاں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ بادی النظر میں یہ واقعہ قرآنِ مجید اور احادیث میں مذکور ختم نبوت کے فیصلے کی حتمیت اور قطعیت کو بھی محل اشکال میں لے آتا ہے۔ یعنی یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے نبی کا آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد دوبارہ نازل ہونا قرآن کی صریح نص کی روشنی میں کیسے دیکھا جائے گا؟[51]

نزولِ مسیح کے واقعے سے متعلق یہ پانچوں باتیں اِس کی غیر معمولی اہمیت کو ثابت کرتی

کیوں نہیں ہوا یا سائنسی علوم اِس کی شہادت کیوں نہیں دیتے؟

[51] چنانچہ علما کے سامنے یہ سوال آتا رہا ہے اور اُنھوں نے اپنے خیال سے اِس کا جواب بھی دیا ہے۔

ہیں اور یہ سوال پیدا کرتی ہیں کہ اِس کی خبر کے ابلاغ کے لیے قرآنِ مجید کے قطعی ذریعے کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا اور اِسے لوگوں کی صواب دید پر کیوں چھوڑ دیا گیا کہ وہ چاہیں تو آگے منتقل کریں اور چاہیں تو نہ کریں اور اِس کے بیان کے لیے جو چاہے اسلوب اختیار کریں؟

تاہم اِس سوال سے قطع نظر، اگر صرف احادیث کے تناظر میں دیکھا جائے تو مذکورہ باتیں درجِ ذیل شواہد کا لازمی تقاضا کرتی ہیں:

1۔ یہ واقعہ صحابہ اور تابعین میں زبان زدِ عام ہونا چاہیے۔

2۔ اِسے جلیل القدر صحابہ کی اکثریت کو روایت کرنا چاہیے۔

3۔ اِسے حدیث کے اولین مجموعوں میں مذکور ہونا چاہیے۔

4۔ اِس کی روایات کو واضح ہونا چاہیے اور ہر قسم کے داخلی ابہام یا تناقض سے پاک ہونا چاہیے۔

5۔ اِس کی روایات اور ذخیرۂ حدیث کی دیگر روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا نزولِ مسیح کی روایتوں میں یہ تقاضے کما حقہٗ پورے ہوتے ہیں؟ اِس کا جواب واضح نفی میں ہے۔ اِس کی تفصیل چند اشکالات کی صورت میں درجِ ذیل ہے۔

پہلا اشکال:

حدیث کی اولین کتاب میں نزولِ مسیح کی روایت شامل نہیں

حدیث کی دستیاب کتابوں میں سے اولین کتاب ''الصحیفۃ الصحیحہ'' ہے، جو ''صحیفہ ہمام ابن منبہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ ہمام بن منبہ تابعی ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ اُنھوں نے یہ صحیفہ 58ھ سے کچھ پہلے مرتب کیا تھا۔ اِس میں کل 138 احادیث شامل ہیں۔ یہ تمام حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات ہیں۔ اِن میں ایمانیات، عبادات،

معاملات، اخلاق و آداب اور دیگر مختلف موضوعات پر احادیث شامل ہیں۔[52] باعثِ تعجب ہے کہ اِن میں نزولِ مسیح کی روایت شامل نہیں ہے۔ یہ استعجاب کئی پہلوؤں سے ہے:

ایک اِس پہلو سے کہ اتنی غیر معمولی روایت کیسے نظر انداز ہوگئی۔

دوسرے اِس پہلو سے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی نزولِ مسیح کی روایات کے راوی ہیں۔ حیران کن بات ہے کہ اُنھوں نے اپنے براہِ راست شاگرد کو جب روایات املا کرائیں تو اُن میں نزولِ مسیح کی روایت کو شامل نہیں کیا، جب کہ وہ اِسے دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں۔

تیسرے اِس پہلو سے کہ اِس صحیفے میں حضرت مسیح سے متعلق یہ دو روایات موجود ہیں:

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: رأى عيسى ابن مريم رجلاً	”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ ابنِ مریم نے ایک شخص کو

---

[52] یہ پوری کتاب اپنی ترتیب سے مسند احمد بن حنبل میں شامل ہے۔ مسند احمد بن حنبل 220ھ تا 237ھ کے درمیان تالیف ہوئی۔ اِس کا مطلب ہے کہ موطا امام مالک (179ھ)، مسند ابو داؤد الطیالسی (204ھ)، مصنف عبدالرزاق (211ھ)، مصنف ابن ابی شیبہ (235ھ) اور بعض دوسری کتب مسند احمد بن حنبل سے پہلے موجود تھیں۔ صحاح ستہ کی تمام کتب اِس کے بعد شائع ہوئیں۔ اِن کی اشاعت کا زمانہ کم و بیش 250ھ تا 303ھ ہے۔ چنانچہ مسند احمد بن حنبل کا حصہ ہونے کی وجہ سے اِسے حدیث کے اولین دستیاب مجموعے کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے دورِ حاضر میں اِس کا قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا۔ اِسے سیرت و تاریخ کے جلیل القدر محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے برلن کی ایک لائبریری سے دریافت کر لیا اور 1955ء میں انڈیا سے شائع کرایا۔ اِس دریافت کے بعد اب متفقہ طور پر اِس کی حیثیت اولین مجموعۂ حدیث کی ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ یہ ہمام ابن منبہ کے استاذ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات (58ھ) سے پہلے مرتب کیا گیا۔ تاہم، اگر اِس کے بعد بھی مرتب ہوا ہو، تب بھی اِس کی اولین مجموعۂ حدیث کی حیثیت ختم نہیں ہوتی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہمام بن منبہ کا سن وفات 131ھ ہے۔

يسرق، فقال له عيسى: سرقت؟ فقال: كلا والذي لا إله إلا هو، فقال عيسى: آمنت بالله وكذبت عيني.
(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 41)

چوری کرتے ہوئے دیکھا۔ اِس پر عیسیٰ علیہ السلام نے اُس سے کہا: کیا تو نے چوری کی ہے؟ اُس نے کہا: ہر گز نہیں، قسم ہے اُس ذات کی، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں اور اپنی آنکھ کو جھٹلاتا ہوں۔"

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنا أولى الناس بعيسى ابن مريم في الاولى والآخرة قالوا: كيف يا رسول الله؟ قال: الانبياء إخوة من علات وأمهاتهم شتى، ودينهم واحد، فليس بيننا نبي.
(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 133)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور لوگوں کے مقابلہ میں عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام کے ساتھ دنیا اور آخرت میں اولیٰ ہوں، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ، کس طرح؟ آپ نے فرمایا: پیغمبر علاتی بھائی ہیں اور اُن کی مائیں علیحدہ ہیں اور اُن کا دین ایک ہے، اور ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی روایت، ظاہر ہے کہ اپنے مضمون کے اعتبار سے اِن دونوں روایتوں سے زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ اگر یہ روایتیں شامل ہیں تو اِن سے نمایاں روایت کیوں شامل نہیں ہے؟

چوتھے، اِس پہلو سے کہ اِس صحیفے میں دجال کے حوالے سے بھی یہ روایت شامل ہے:

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقوم الساعة حتى ينبعث دجالون كذابون قريب من ثلاثين

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک تیس کے قریب جھوٹے

كلهم يزعم أنه رسول الله.

(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 24)

دجال نہ نکلیں گے۔ اُن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔“

سوال یہ ہے کہ اگر دجال سے متعلق یہ روایت شامل ہے تو دجال سے متعلق سب سے اہم روایت شامل کیوں نہیں ہے، جس میں حضرت مسیح کے ہاتھوں دجال کے قتل کا ذکر ہے؟

پانچویں، اِس پہلو سے کہ اِس صحیفے میں قرب قیامت کی پانچ روایتیں نقل ہوئی ہیں۔ اِن میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے قریب سورج مغرب سے طلوع ہو گا؛ مال کی کثرت ہو جائے گی؛ علم اٹھالیا جائے گا؛ فتنوں کا ظہور ہو گا؛ قتل و غارت بڑھ جائے گی؛ دو گروہوں کے مابین ایک بڑی جنگ ہو گی؛ مسلمان ایسی قوم سے لڑیں گے، جس کے لوگوں کے چہرے سرخ، ناکیں چپٹی اور آنکھیں چھوٹی ہوں گی۔ روایتیں یہ ہیں:

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها فإذا طلعت ورآها الناس آمنوا أجمعون، وذلك حين لا ينفع نفسًا إيمانها لم تكن آمنت من قبل أو كسبت في إيمانها خيرًا.

(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 25)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک آفتاب اپنے مغرب سے نہ نکلے۔ (پھر اُس کے بعد) جب آفتاب طلوع ہو گا اور لوگ اُس کو دیکھیں گے تو سب کے سب ایمان لائیں گے، لیکن یہ اُس وقت ہو گا، جب کسی شخص کو اُس کا ایمان لانا فائدہ نہ پہنچائے گا۔ گویا اِس سے پہلے نہ وہ ایمان لایا تھا اور نہ اپنے ایمان سے کوئی بھلائی حاصل کی تھی۔“

وقال رسول الله صلى الله عليه

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

وسلم: لا تقوم الساعة حتى يكثر فيكم المال فيفيض حتى يهم رب المال من يتقبل منه صدقته. قال: ويقبض العلم ويقترب الزمان وتظهر الفتن ويكثر الهرج،قالوا: الهرج اى هو يا رسول اللّٰه؟ قال: القتل القتل.(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 22)

فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک کہ تم میں مال کی کثرت نہ ہو جائے، وہ بہتا پھرے گا، یہاں تک کہ مال دار کو اِس بات کی فکر ہو گی کہ اُس سے اُس کا صدقہ (زکوٰۃ) کون قبول کرے گا۔ اور آپ نے فرمایا: علم اٹھا لیا جائے گا اور زمانہ (قیامت سے) قریب تر ہو جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے اور ہرج کثرت سے ہو گا۔ (لوگوں نے پوچھا): یارسول اللہ، ہرج کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: قتل، خوں ریزی۔"

وقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لا تقوم الساعة حتى تقتتل فئتان عظيمتان تكون بينهما مقتلة عظيمة ودعواهما واحدة. (صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم 23)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک دو بڑی جماعتیں آپس میں جنگ نہ کریں۔ اُن دونوں کے درمیان جنگِ عظیم ہو گی اور اُن دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہو گا۔"

وقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا جور كرمان، قومًا من الاعاجم حمر الوجوه فطس الانوف، صغار الاعين، كأن وجوههم المجان المطرقة.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک کہ تم جور کرمان سے نہ لڑو۔ وہ ایک عجمی (غیر عرب) قوم ہے، سرخ چہرے، چپٹی ناک اور

(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم125) چھوٹی آنکھوں والی، گویا اُن کے چہرے کوٹ کر چپٹی کی گئی ڈھال جیسے ہیں۔"

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا تقوم الساعۃ حتی تقاتلوا قومًا نعالھم الشعر. "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک کہ تم ایک ایسی قوم سے نہ لڑو، جس کے لوگوں کے جوتے بالوں کے ہوں گے۔"

(صحیفہ ہمام بن منبہ، رقم127)

"صحیفہ ہمام بن منبہ" میں قربِ قیامت کی علامات پر مبنی اِن روایتوں کا شامل ہونا اور اِس ضمن کی اہم ترین علامت نزولِ مسیح کا شامل نہ ہونا نزولِ مسیح کی روایتوں پر اشکال کا باعث ہے۔

دوسرا اشکال:

اولین مجموعۂ حدیث میں نزولِ مسیح کی کوئی روایت شامل نہیں

موطا احادیث کی پہلی منضبط کتاب ہے۔ اِسے امام مالک بن انس بن مالک نے 40 سال کی محنتِ شاقہ سے تالیف کیا تھا۔ یہ خلیفہ منصور عباسی کی فرمایش پر مرتب کی گئی اور کم و بیش 140ھ میں مکمل ہوئی۔ اِس میں احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام مالک نے اپنی تمام زندگی مدینۃ النبی میں گزاری اور اُسی کے ماحول میں اپنی کتاب تصنیف کی۔[53]

---

[53] امام مالک کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے جدِ اعلیٰ ابو عامر مدینہ تشریف لائے اور مسلمان

اُنھوں نے اُن لوگوں سے روایتوں کو جمع کیا، جنھوں نے جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مستقل صحبت اور رفاقت اختیار کی تھی۔ یہ کتاب امام مالک کی زندگی ہی میں پورے عالم اسلام میں مقبول ہو گئی تھی۔ امام مالک اِس کی تالیف کے بعد کم و بیش چالیس سال تک حیات رہے اور اِس پر نظر ثانی کرتے رہے۔[54]

نزولِ مسیح کی روایت اِس مجموعۂ حدیث میں شامل نہیں ہے۔

اشکال کا ایک پہلو یہ ہے کہ اِس مجموعے کا زمانۂ تالیف صحابہ کے زمانے کے بالکل قریب ہے۔ احادیث کے باقی مجموعے اِس کے کم و بیش سو سال بعد تالیف ہوئے ہیں۔ تمام احادیث کے راوی صحابۂ کرام ہیں۔ کیا وجہ ہوئی ہے کہ صحابۂ کرام کی یہ اہم ترین روایت، جسے زبان زدِ عام ہونا چاہیے، امام مالک کو منتقل نہیں ہو سکی؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ مجموعہ چالیس سال کی طویل مدت میں مرتب ہوا ہے۔ اِس پورے عرصے کے دوران میں امام مالک اِس کا درس دیتے رہے ہیں، اِس کی نوک پلک سنوارتے رہے ہیں اور اِس میں ترمیم و اضافہ کرتے رہے ہیں۔ اتنے طویل عرصۂ ترتیب و تدوین میں باور

ہوئے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اِس لیے اُنھیں صحابی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ اُنھوں نے قبیلۂ تمیم میں شادی کی اور مدینہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ امام مالک کے والد انس اور چچا ابو سہیل نافع ابو عامر سے احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ ابو سہیل نافع بڑے محدث تھے اور امام زہری کے اساتذہ میں شامل تھے۔ امام مالک کے بڑے بھائی نضر بھی حدیث کے عالم تھے۔ اِس تفصیل سے واضح ہے کہ آپ کا خاندان مدینۃ النبی میں سکونت پذیر تھا اور علم حدیث سے خاص شغف رکھتا تھا۔

[54] جمہور علما نے موطا کو حدیث کی کتابوں کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ میں نے کتاب اللہ کے بعد روے زمین پر موطا امام مالک سے زیادہ کوئی صحیح کتاب نہیں دیکھی۔ امام شاہ ولی اللہ کی راے ہے کہ فقہ میں موطا امام مالک سے زیادہ کوئی مستحکم کتاب نہیں ہے۔

نہیں کیا جا سکتا کہ یہ روایت اُن تک نہ پہنچی ہو۔ اگر نہیں پہنچی تو یہ امر بھی باعث اشکال ہے اور اگر پہنچی ہے اور اُنھوں نے اِسے قبول نہیں کیا تو یہ امر بھی اشکال کا باعث ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ امام مالک نے یہ کتاب اسلام کے عین مرکز، یعنی مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھ کر تالیف کی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ مقام ہے، جہاں جلیل القدر صحابۂ کرام نے اپنی زندگیاں گزاری ہیں، باقی عالم اسلام کے مقابلے میں تابعین کی اکثریت بھی اِسی کے گرد و نواح میں مقیم تھی، اور وہ تابعین جو دیگر ممالک میں بستے تھے، اُنھیں بھی حج و عمرہ کی ادائیگی اور مسجدِ نبوی کی زیارت کے لیے اِسی علاقے میں آنا ہوتا تھا۔ گویا کہ اِس امر کا امکان بہ ظاہر مسدود ہے کہ یہ روایت امام مالک تک نہ پہنچی ہو۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تعلیم و تربیت کا مرکز حجاز کا علاقہ رہا ہے۔[55] نزولِ مسیح کی روایات کے تابعی راویوں میں سے متعدد راوی سرزمین حجاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر امام مالک کے معاصرین ہیں۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں، جن سے امام مالک کی بہ کثرت ملاقاتیں قرین صواب ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نہ اِن لوگوں نے امام مالک سے نزولِ مسیح کی روایتوں کا ذکر کیا اور نہ امام مالک نے احادیث کی تحقیق و تدوین کے باوجود اُن سے اِن کے بارے میں معلوم کیا۔

پانچواں پہلو یہ ہے کہ نزولِ مسیح کی روایات کے اولین راوی معمر بن راشد (تابعی) امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ معمر 95ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں یمن میں مقیم ہو گئے۔ یمن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہمام بن منبہ کا سلسلۂ تعلیم و تدریس جاری تھا۔ معمر بن راشد نے اُن کی شاگردی اختیار کی۔ اُن کے علاوہ اُنھوں نے قتادہ اور ابنِ شہاب زہری سے بھی کسبِ فیض کیا۔[56] 153ھ میں 58 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ سوال یہ ہے

---

[55] اِس میں مکہ، مدینہ، طائف وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

[56] معمر بن راشد نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اُن کے اسما یہ ہیں: ثابت البنانی، قتادہ بن

کہ معمر بن راشد اور امام مالک کی باہمی معاصرت کے باوجود کیا وجہ ہے کہ امام مالک نے اُن سے نزولِ مسیح کی روایت نہیں لی؟

چھٹا پہلو یہ ہے کہ نزولِ مسیح کی روایات کے بعض راویوں سے امام مالک نے نزولِ مسیح کی روایتوں کے علاوہ دیگر روایتیں قبول کی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اُنھوں نے اُن سے دیگر روایتوں کو تو لے لیا، مگر نزولِ مسیح کی غیر معمولی روایت کو چھوڑ دیا؟ نزولِ مسیح کی روایتوں کے بعض راوی امام مالک کے ہم عصر ہیں، بعض اُن کے زمانے میں مدینہ کے رہنے والے بھی ہیں، مگر اُن سے امام صاحب نے کوئی بھی روایت نہیں لی۔ اِس پہلو سے چند راویوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

1۔ ابن شہاب زہری (وفات 124ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے تقریباً 115 روایتیں لی ہیں، مگر نزولِ مسیح کی روایت نہیں لی۔

2۔ عبد الرحمٰن بن ہرمز الاعرج (وفات 117ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ اِن سے امام مالک نے کم و بیش 61 روایتیں لی ہیں، مگر نزولِ مسیح کی روایت نہیں لی۔

3۔ صالح بن کیسان (وفات 140ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے 3 روایتیں لی ہیں، مگر نزولِ مسیح کی

دعامہ، ابنِ شہاب الزہری، عاصم الاحول ایوب، الجعد ابی عثمان، زید بن اسلم، صالح بن کیسان، عبد اللہ بن طاؤس، جعفر بن برقان، الحکم بن ابان، اشعث بن عبد اللہ الحدانی، اسماعیل بن امیہ، ثمامہ بن عبد اللہ بن انس، بہز بن حکیم، سماک بن الفضل، عبد اللہ بن عثمان بن خثیم، عبد اللہ بن عمر العمری، یحییٰ بن ابی کثیر، ہمام بن منبہ، ہشام بن عروہ، محمد بن المنکدر، عمرو بن دینار، عطا الخراسانی، عبد الکریم الجزری۔

روایت نہیں لی۔

4۔ زیاد بن سعد الخراسانی (وفات 150ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے 3 روایتیں لی ہیں، مگر نزولِ مسیح کی روایت نہیں لی۔

5۔ محمد بن مسلم بن تدرس ابوزبیر (وفات 128ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ مکہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

6۔ اسود بن قیس العبدی الکوفی (وفات 140ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ ان سے امام مالک نے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

7۔ سعید بن جمہان ابو حفص (وفات 136ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

8۔ ابو مالک الاشجعی (وفات 150ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

9۔ معمر بن راشد (وفات 153ھ) نزولِ مسیح کی روایت کے راوی ہیں۔ یہ بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ امام مالک کے ہم عصر ہیں۔ اِن سے امام مالک نے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

ساتواں پہلو یہ ہے کہ اِس کتاب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال سے متعلق باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ اِس کا عنوان ہے: 'باب صفة عیسیٰ بن مریم والدجال'، یعنی عیسیٰ ابنِ مریم اور دجال کے احوال کا باب۔ اِس باب کے تحت یہ ایک ہی روایت منقول ہے:

عن عبد اللّٰہ بن عمر، أن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: أرانی	”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

الليلة عند الكعبة، فرأيت رجلاً آدم كأحسنِ ما أنت راء من أدم الرجال، له لمة كأحسن ما أنت راء من اللمم قد رجلها، فهي تقطر ماءً متكئًا على رجلين أو على عواتق رجلين يطوف بالكعبة، فسألت من هذا ؟ قيل: هذا المسيح ابن مريم، ثم إذا أنا برجل جعد قطط أعور العين اليمنى، كأنها عنبة طافية، فسألت: من هذا؟ فقيل لي: هذا المسيح الدجال.
(موطا، رقم 3405)

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے رات کو رؤیا میں دیکھا کہ میں کعبہ کے پاس موجود ہوں۔ وہاں میں نے گندمی رنگ کے ایک خوب صورت شخص کو دیکھا۔ —— جیسا کہ تم نے گندمی رنگ کے خوب صورت مرد دیکھے ہوں گے —— اُس کی لمبی زلفیں تھیں جیسا کہ تم نے خوب صورت لمبی زلفیں دیکھی ہوں گی۔ اُس مرد نے اپنے بالوں میں کنگھی کر رکھی ہے اور اُن سے پانی ٹپک رہا ہے۔ وہ دو آدمیوں پر یا دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ عیسیٰ ابنِ مریم ہیں۔ پھر میں نے ایک اور آدمی کو دیکھا۔ وہ نہایت گھنگریالے بالوں والا تھا اور داہنی آنکھ سے اندھا تھا۔ اُس کی آنکھ ایسی تھی، جیسے پھولا ہوا انگور ہو۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ مسیح دجال ہے۔“

باعثِ اشکال ہے کہ باقاعدہ باب بھی موجود ہے اور اُس میں حضرت مسیح اور دجال کی روایت بھی ہے، مگر نزولِ مسیح کی زیادہ نمایاں روایت مذکور نہیں ہے۔ پوری کتاب میں اشارتاً بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔

تیسرا اشکال:

امام بخاری نے نزولِ مسیح کی چند روایتیں ہی قبول کی ہیں

نزولِ مسیح کی مرفوع روایتوں[57] کی تعداد 80 سے زائد ہے۔ یہ موطا امام مالک کے علاوہ حدیث کی کم و بیش تمام کتب میں نقل ہوئی ہیں۔ یہ روایتیں اِن صحابہ سے مروی ہیں:

1۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

2۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ

3۔ النواس بن سمعان رضی اللہ عنہ

4۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ

5۔ حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ

6۔ ثوبان رضی اللہ عنہ

7۔ مجمع بن الجاریہ رضی اللہ عنہ

8۔ ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ

9۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

10۔ عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ

11۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ

12۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

13۔ انس رضی اللہ عنہ

---

[57] ”مرفوع“ سے مراد وہ روایت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان ہو۔ یعنی اُس کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ رہی ہو۔ اگر سلسلۂ سند صحابی تک ہو تو اُسے ”موقوف“ اور اگر تابعی تک ہو تو اُسے ”مقطوع“ کہتے ہیں۔

14۔ واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ

15۔ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

16۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

17۔ اوس بن اوس الثقفی رضی اللہ عنہ

18۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ

19۔ ام المومنین عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا

20۔ سفینہ مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

21۔ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ

22۔ عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ

23۔ عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ

24۔ ابو سعید الخذری رضی اللہ عنہ

25۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

26۔ کیسان بن عبد اللہ بن طارق رضی اللہ عنہ

27۔ سلمہ بن نفیل السکونی رضی اللہ عنہ

28۔ ام المومنین صفیہ رضی اللہ عنہا

29۔ نافع بن کیسان رضی اللہ عنہ

30۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ

31۔ عمرو بن عوف المزنی رضی اللہ عنہ

نزولِ مسیح کی مختلف اور متنوع روایتوں میں سے امام بخاری نے درجِ ذیل تین روایتوں کا انتخاب کیا ہے:[58]

---

[58] اِن کے تراجم باب اول میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

1۔ حدثنا إسحاق، أخبرنا يعقوب بن إبراهيم، حدثنا أبي، عن صالح، عنِ ابنِ شهاب أن سعيد بن المسيب، سمع أبا هريرة رضی اللہ عنه، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : والذی نفسی بیده، لیوشکن أن ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا، فیکسر الصلیب، ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة، ویفیض المال حتی لا یقبله أحد، حتی تکون السجدة الواحدة خیرًا من الدنیا وما فیها، ثم یقول أبو هریرة : واقرءوا إن شئتم : وإن من أهل الکتاب إلا لیؤمنن به قبل موته، ویوم القیامة یکون علیهم شهیدًا.

(بخاری، رقم 3448)

2۔ حدثنا قتیبة بن سعید، حدثنا اللیث، عن ابن شهاب، عن ابن المسیب أنه سمع أبا هریرة رضی اللہ عنه، یقول : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : والذی نفسی بیده، لیوشکن أن ینزل فیکم ابن مریم حکمًا مقسطًا، فیکسر الصلیب، ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة، ویفیض المال حتی لا یقبله أحد۔(بخاری، رقم 2222)

3۔ حدثنا ابن بکیر، حدثنا اللیث، عن یونس، عن ابن شهاب، عن نافع، مولی أبی قتادة الانصاری، أن أبا هریرة، قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : کیف أنتم إذا نزل ابن مریم فیکم، وإمامکم منکم۔(بخاری، رقم 3449)

اِن روایتوں کے مطالعے سے درجِ ذیل حقائق واضح ہوتے ہیں:

1۔ امام بخاری نے 80 سے زیادہ مرفوع روایتوں میں سے صرف تین روایتیں لی ہیں۔

2۔ اِن تین روایتوں میں سے دو کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ایک ہی روایت کے دو مختلف طریق ہیں۔ یعنی موقع کلام اور مدعا و مفہوم ایک ہے، مگر امام بخاری تک راویوں کے دو الگ الگ سلسلوں سے پہنچے ہیں۔

3۔ نزولِ مسیح کی مفصل روایتیں بھی ہیں اور مختصر بھی، امام صاحب نے مختصر روایتوں پر اکتفا کیا ہے۔

4۔ مرفوع روایتیں کم و بیش 30 صحابۂ کرام سے مروی ہیں۔ امام صاحب نے اِن میں سے

صرف ایک صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتوں کا انتخاب کیا ہے۔

5۔ اِسی طرح اِن تینوں میں بنیادی راوی ابنِ شہاب زہری ہیں۔ یعنی اُنھوں نے اِس ضمن میں زہری ہی کی روایتوں کا اعتبار کیا ہے۔

امام بخاری کا یہ طرزِ عمل نزولِ مسیح کی جملہ روایتوں کے بارے میں اُن کے تردد کا تاثر دیتا ہے۔

چوتھا اشکال:

مسلم کی روایت میں نزولِ مسیح کے وقت کا تعین

چوتھا اشکال یہ ہے کہ روایتوں میں مذکور واقعۂ نزولِ مسیح کے بعض متصل اجزا زمانۂ ماضی میں ظاہر ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اُن کے وقوع کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول نہیں ہوا تو پھر واقعے کی صحت پر کیسے یقین قائم کیا جا سکتا ہے؟ اِس امر کو بیان کرنے سے پہلے نفس واقعہ سے متعلق دو باتوں کا ادراک ضروری ہے۔

اولاً، نزولِ مسیح کی روایتیں مستقبل کے ایک واقعے کا بیان ہیں۔ اِن کے رد و قبول کے حوالے سے مسلمانوں کے اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اِن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت قابلِ اطمینان ہے، لہٰذا مسیح علیہ السلام کا نزول یقینی ہے۔ اِس کے برعکس، بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اِن روایتوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت قابلِ اطمینان نہیں ہے، اِس لیے اِن کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کا تصور قائم کرنا درست نہیں ہے۔

یہ اختلاف اُس وقت تک قائم رہ سکتا ہے، جب تک درجِ ذیل دو صورتوں میں سے کوئی صورت واقع نہ ہو جائے۔

ایک یہ کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو جائے۔ اِس صورت میں

اُن لوگوں کا موقف درست ثابت ہو جائے گا، جو نزولِ مسیح کی روایتوں کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو درست سمجھتے ہیں۔ اِس کے بعد اختلاف کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قیامت واقع ہو جائے اور مسیح علیہ السلام نازل نہ ہوں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اُن لوگوں کی بات صحیح ثابت ہو گی، جو اِن روایتوں کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو درست نہیں سمجھتے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اختلاف کا معاملہ کسی مشہود واقعے سے متعلق ہو تو اُس کا وقوع یا عدمِ وقوع رفع اختلاف کے لیے دلیل قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ واقعہ اگر واقع ہو جائے تو اُس کے قائلین کی بات ثابت ہوتی ہے اور اگر اُس کے وقوع کا وقت گزر جائے اور وہ واقع نہ ہو تو اختلاف کرنے والوں کی بات ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اُس کے بعد ابہام یا اختلاف کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

ثانیاً، روایتوں میں مذکور نزولِ مسیح کا واقعہ کئی جزوی واقعات کا مجموعہ ہے۔ جب کسی واقعے کی صورت یہ ہو تو اُس کا بہ تمام و کمال روبہ عمل ہونا ضروری ہے۔ یعنی جو اجزا اُس کا حصہ ہیں، اُنھیں بعینہٖ ظاہر ہونا چاہیے۔ وقت اور زمانے کے لحاظ سے بھی، ترتیبِ وقوع کے لحاظ سے بھی اور ضمنی تفصیلات کے لحاظ سے بھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ واقعہ اگر ایک دور سے متعلق ہے تو اُسے مختلف ادوار کے واقعات کو جوڑ کر مکمل کیا جائے۔ یا اگر کچھ اجزا بیانِ واقعہ سے مختلف ہیں تو اُنھیں نظر انداز کر دیا جائے یا اگر بیانِ واقعہ کی بعض کڑیاں ظہورِ واقعہ میں موجود نہیں ہیں تو اُنھیں کوئی مبہم یا خلافِ عقل تاویل کر کے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیے گئے واقعے کو عقل و نقل کے ہر معیار پر پورا اترنا چاہیے۔ اِس کی وجہ یہ کہ آپ کی بات اللہ کی بات ہے، جس میں خطا اور سہو و نسیان کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔

اِس تمہید کے بعد اب اُس روایت کا مطالعہ کرتے ہیں، جس میں نزولِ مسیح کے وقت کا

تعین نہایت صراحت کے ساتھ ہوا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے:

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: لا تقوم الساعة حتى ينزل الروم بالاعماق أو بدابق، فيخرج إليهم جيش من المدينة، من خيار أهل الارض يومئذ. فإذا تصافوا، قالت الروم: خلوا بيننا وبين الذين سبوا منا نقاتلهم،فيقول المسلمون: لا، والله لا نخلى بينكم وبين إخواننا. فيقاتلونهم، فينهزم ثلث لا يتوب الله عليهم أبدًا، ويقتل ثلثهم، أفضل الشهداء عند الله ويفتتح الثلث، لا يفتنون أبدًا. فيفتتحون قسطنطينية، فبينما هم يقتسمون الغنائم،قد علقوا سيوفهم بالزيتون، إذ صاح فيهم الشيطان: إن المسيح قد خلفكم في أهليكم، فيخرجون، وذلك باطل. فإذا جاءوا الشأم خرج، فبينما هم يعدون للقتال، يسوون الصفوف، إذ أقيمت الصلاة، فينزل عيسى ابن مريم صلى الله عليه وسلم، فأمهم فإذا رآه عدو

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہو گی، یہاں تک کہ روم کے نصاریٰ کا لشکر اعماق میں یا دابق میں اترے گا۔ پھر اُس سے جنگ کے لیے مدینہ کا ایک لشکر نکلے گا، جو زمین والوں میں سب سے بہتر ہو گا۔ جب دونوں لشکر صفیں باندھ لیں گے تو رومی (مدینہ کے لشکر والوں سے) کہیں گے: تم ہمارے اور اِن لوگوں کے درمیان سے الگ ہو جاؤ جنھوں نے ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنایا ہوا ہے تا کہ ہم اِن سے قتال کریں۔ مسلمان جواب دیں گے: نہیں اللہ کی قسم، ہم کبھی اپنے بھائیوں سے الگ نہ ہوں گے۔ پھر جنگ ہو گی تو مسلمانوں کا ایک تہائی لشکر بھاگ نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اِن کی توبہ کبھی قبول نہ کرے گا۔ ایک تہائی لشکر مارا جائے گا، یہ لوگ اللہ کے نزدیک سب شہیدوں میں افضل ہوں گے۔ باقی ماندہ ایک تہائی لشکر کو فتح حاصل ہو گی۔ وہ عمر بھر کبھی

الله، ذاب كما يذوب الملح في الماء، فلو تركه لانذاب حتى يهلك، ولكن يقتله الله بيده، فيريهم دمه في حربته. (رقم7460)

فتنے اور آزمایش میں نہ پڑیں گے۔ پھر وہ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ اُس کے بعد جب وہ مال غنیمت کو بانٹ رہے ہوں گے اور اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں سے لٹکا چکے ہوں گے تو اچانک شیطان اعلان کرے گا کہ دجال تمھارے پیچھے تمھارے اہل وعیال کے پاس پہنچ چکا ہے۔ یہ خبر سن کر مسلمان فوراً واپس روانہ ہو جائیں گے۔ تاہم، یہ خبر جھوٹ ہو گی۔ پھر جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال نکلے آئے گا۔ چنانچہ جس وقت مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو کر نماز (فجر) کے لیے صفیں باندھ رہے ہوں گے تو اُس وقت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے اور اُن کی امامت فرمائیں گے۔ جب اللہ کا دشمن دجال عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو وہ ایسے تحلیل ہونا شروع ہو جائے گا، جیسے نمک پانی میں تحلیل ہوتا ہے۔—— گویا عیسیٰ علیہ السلام اُس کو یونہی چھوڑ دیں تو وہ خود بہ خود ختم ہو جائے۔—— البتہ، اللہ تعالیٰ اُس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے قتل کرائیں

گے۔ پھر اللہ اُنھیں دکھائے گا کہ دجال کا
خون حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نیزے
پر لگا ہوا ہے۔“

اِس روایت سے درجِ ذیل باتیں مفہوم ہوتی ہیں:

- یہ واقعہ قیامت سے پہلے شام کی سرزمین پر رونما ہو گا۔
- شام کی مسلمان حکومت عیسائیوں کے کچھ لوگوں کو قید کر لے گی۔
- اِس کے جواب میں عیسائیوں کا لشکر شام پر حملے کے لیے روانہ ہو گا۔
- یہ لشکر بڑھتے بڑھتے شام کے اندر ”اعماق“ یا ”دابق“ کے مقام تک پہنچ جائے گا۔
- مدینہ منورہ کی مسلمان حکومت کو اِس حملے کی خبر ہو گی تو وہ اہل شام کی مدد کے لیے اپنا لشکر روانہ کرے گی۔
- یہ لشکر نہایت صالح مسلمانوں پر مشتمل ہو گا۔
- جب یہ لشکر شام پہنچے گا اور عیسائی فوج کے مقابل صف آرا ہو گا تو عیسائی لشکر کی طرف سے اُسے کہا جائے گا کہ وہ اُن کے اور شام کے معاملے میں مداخلت نہ کرے اور ایک طرف ہو جائے۔
- مدینہ کے لشکری پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم اپنے بھائیوں کو تمھارے مقابلے میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔
- اِس کے بعد جنگ شروع ہو جائے گی۔
- جنگ شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی فوج کا ایک تہائی حصہ فرار ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑا جرم ہو گا، جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائیں گے۔
- مسلمانوں کی فوج کا ایک تہائی حصہ شہید ہو جائے گا۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک افضل الشہدا ہوں گے۔

- باقی ماندہ ایک تہائی فوج عیسائیوں پر فتح حاصل کر لے گی۔
- فاتحین کا یہ لشکر پھر آگے بڑھے گا اور عیسائیوں کے مرکز قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گا۔
- بالآخر قسطنطنیہ فتح ہو کر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آجائے گا۔
- فتح حاصل کرنے کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم ہو گی اور مسلمان فوج کے سپاہی مطمئن ہو کر اپنی تلواریں زیتون کے درختوں سے لٹکا دیں گے۔
- اِسی اثنا میں شیطان مسلمانوں کو یہ خبر دے گا کہ مسلمانو، تمھارے پیچھے تمھارے بیوی بچوں کے پاس مسیح دجال پہنچ چکا ہے۔
- یہ سن کر مسلمانوں کا لشکر قسطنطنیہ سے واپس روانہ ہو گا۔
- واپس پہنچ کر جب یہ لشکر نماز کے لیے صفیں باندھے گا تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول ہو گا۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز کی امامت فرمائیں گے۔
- دجال جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو اُس کا وجود پگھلنا شروع ہو جائے گا۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس کے پگھل کر ختم ہونے سے پہلے ہی اپنا نیزہ مار کر اُسے قتل کر دیں گے۔

روایت کی اِس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول اُس وقت ہو گا، جب مسلمانوں کا لشکر قسطنطنیہ کو فتح کر کے واپس لوٹے گا۔ مکرر جان لیجیے کہ مسلم کی یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام عین اُس موقع پر نازل ہوں گے، جس وقت مسلمانوں کی فوج قسطنطنیہ کو فتح کر لینے کے بعد دجال کے ظہور کی خبر سن کر مدینہ کی طرف واپس پلٹے گی۔

اب حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ 29 / مئی 1453ء بہ مطابق 20 / جمادی الاول 857ھ کو

قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے۔ اُس کے بعد تا حال وہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے، بلکہ استنبول[59] کے نام سے اسلامی ملک ترکیہ (Türkiye) کا سب سے بڑا شہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلم کی حدیث نے حضرت مسیح کے نزول کا جو وقت متعین کیا ہے، وہ قسطنطنیہ کی فتح کے متصل بعد ہے۔ یہ وقت جون / جولائی 1453ء میں گزر چکا ہے۔ قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے، مگر نہ دجال ظاہر ہوا ہے اور نہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوئے ہیں۔

اب اگر حقیقت یہ ہے تو بیانِ واقعہ کی دو باتوں میں سے ایک بات کو صحیح ماننا ہو گا اور دوسری کو راوی کی غلطی یا اضافے پر محمول کرنا ہو گا۔

یا یہ ماننا ہو گا کہ روایت میں نزولِ مسیح کی بات تو درست ہے، مگر قسطنطنیہ کی فتح اور اُس کے فاتح لشکر کا ذکر اضافی ہے، جس کا نزولِ مسیح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یا یہ ماننا ہو گا کہ روایت میں قسطنطنیہ کی فتح اور اُس کے فاتح لشکر کا ذکر تو درست ہے، مگر نزولِ مسیح کی بات اضافی ہے۔

اِن دونوں واقعات کے وقوع کو بہ یک وقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اِن باہم متصل واقعات میں سے ایک واقعہ 570 سال پہلے رونما ہو چکا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات میں سے ایک کو قبول کرنے اور دوسرے کو قبول نہ کرنے کی صورت میں پورا بیانِ واقعہ ہی محل اشتباہ میں آ جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی اگر صحیح نقل ہو گئی ہے تو اُس میں ادنیٰ درجے میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ وہ کاتبِ تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اُسی طرح رونما ہوتا ہے، جیسا کہ اُس کے پیغمبر کی زبانِ فیض ترجمان سے صادر ہوا ہے۔

ہمارے علما نے اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مذکورہ دو امکانات میں سے کسی ایک کو

---

[59] یہ قسطنطنیہ کا جدید نام ہے۔

ترجیح دینے یا روایت پر توقف کرنے کے بجائے اِس کی ایک تاویل پیش کی ہے۔ اِس تاویل کے مطابق 1453ء میں واقع ہونے والی قسطنطنیہ کی فتح وہ فتح نہیں ہے، جس کا ذکر روایت میں ہوا ہے۔ اُن کے نزدیک فتح قسطنطنیہ کا واقعہ ایک مرتبہ پھر رونما ہوگا۔ اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ معاملات پیش آئیں گے، جن کا ذکر مذکورہ روایت میں ہوا ہے۔

اِس تاویل پر چند عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا اشکال یہ ہے کہ قسطنطنیہ کا جو غیر معمولی تاریخی پس منظر ہے اور جس طرح مسلمانوں نے اُس کو فتح کرنے کے لیے صدیوں تک مسلسل جدوجہد کی ہے اور جس طرح اُنھوں نے اِس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی اور بشارت کو مدِ نظر رکھا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ اگر دوبارہ بھی مفتوح ہوتا ہے تو یہ دوسری فتح پہلی فتح جتنی غیر معمولی اور عظیم الشان نہیں ہو سکتی۔

اِس اشکال کو سمجھنے کے لیے قسطنطنیہ کے پس منظر اور اُس کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد کی بنیادی معلومات کو جاننا ضروری ہے۔

قسطنطنیہ (Constantinople) استنبول کا قدیم نام ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور اِس شہر کو اپنا دار السلطنت بنالیا۔ اُسی کے نام کی نسبت سے اِس کا نام قسطنطنیہ پڑ گیا۔ یہ شہر گیارہ سو سال تک عیسائیوں کی رومی سلطنت کا دار الحکومت رہا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں عیسائی دنیا دو بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔ مغربی سلطنت کا دار الحکومت روم اور مشرقی سلطنت کا دار الحکومت قسطنطنیہ بن گیا۔ مشرقی سلطنت میں بلقان، یونان، ایشاے کوچک، شام، مصر، حبشہ وغیرہ شامل تھے۔ اِس کے بڑے کلیسا کے سربراہ کو بطریق (Patriarch) کہا جاتا تھا۔ مغربی سلطنت کے کلیسا کا سربراہ پوپ (Pope) کہلاتا تھا۔[60] عیسائیت کی مذہبی تاریخ میں بھی قسطنطنیہ کو غیر معمولی حیثیت حاصل

---

[60] سلطنتِ روما اپنے عہدِ عروج میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور دنیا پر اُس کا سیاسی اور تہذیبی

تھی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیوں کے دو مرکزی کلیساؤں میں سے ایک اِس شہر میں قائم تھا۔ اِس کا نام آیا صوفیہ تھا۔ یہ عیسائیوں کی قدیم ترین اور مقدس عبادت گاہ تھی۔ اِس کے بارے میں مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ یہ کلیسا کبھی کسی غیر عیسائی کے قبضے میں نہیں جائے گا۔

قسطنطنیہ کی یہی غیر معمولی حیثیت ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس پر لشکر کشی کرنے والے مسلمانوں کو جنت کی بشارت سنائی تھی۔ بخاری میں ہے:

فحدثتنا أم حرام: أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا، قالت ام حرام: قلت: يا رسول الله، انا فيهم؟ قال: انت فيهم ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: اول جيش من امتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: انا فيهم يا رسول الله؟ قال: لا.
(رقم 2924)

”اُمِ حرام رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو بحری سفر کر کے جہاد کے لیے جائے گا، اُس نے (اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت) واجب کر لی ہے۔ اُمِ حرام نے بیان کیا کہ میں نے کہا تھا: یا رسول اللہ، کیا میں بھی اُن کے ساتھ ہوں گی؟ آپ نے فرمایا تھا کہ ہاں، تم بھی اُن کے ساتھ ہو گی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر (رومیوں کے بادشاہ) کے شہر (قسطنطنیہ) پر چڑھائی کرے گا، اُس کی مغفرت ہو گی۔ میں نے کہا: کیا میں بھی اُن کے ساتھ ہوں

غلبہ قائم تھا۔

گی یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔''

مسلم میں ہے:

عن نافع بن عتبة، قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة، قال: فاتى النبي صلى الله عليه وسلم قوم من قبل المغرب عليهم ثياب الصوف، فوافقوه عند اكمة، فإنهم لقيام ورسول الله صلى الله عليه وسلم قاعد. قال: فقالت لي نفسي: ائتهم فقم بينهم وبينه لا يغتالونه، قال: ثم قلت: لعله نجي معهم. فاتيتهم، فقمت بينهم وبينه، قال: فحفظت منه اربع كلمات اعدهن في يدي. قال: تغزون جزيرة العرب، فيفتحها الله ثم فارس، فيفتحها الله ثم تغزون الروم فيفتحها الله، ثم تغزون الدجال فيفتحه الله. قال: فقال نافع: يا جابر، لا نرى الدجال يخرج حتى تفتح الروم. (رقم 7466)

''حضرت نافع بن عتبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ مغرب کی طرف سے آئے۔ وہ بالوں سے بنے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ٹیلے کے پاس ملے۔ وہ لوگ کھڑے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے دل نے مجھے کہا کہ تو اُن لوگوں کے پاس چلا جا اور اُن کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کھڑا ہو جا، ممکن ہے کہ وہ آپ کو قتل کرنے کی جسارت کریں۔ پھر میرے دل نے مجھ سے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ اُن سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہوں (اور میرا جانا نامناسب ہو)۔ بہرحال (پہلے خیال کو ترجیح دیتے ہوئے) میں اُن کے پاس چلا گیا اور اُن

لوگوں کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اِس موقع پر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چار باتیں یاد کیں، جنھیں آپ نے میرے ہاتھ پر گنا۔ آپ نے فرمایا: پہلے تم جزیرۂ عرب میں (کفار سے) جہاد کرو گے، اللہ اُس میں فتح عطا فرمائے گا۔ پھر فارس سے جہاد کرو گے، اللہ تعالیٰ اُس میں بھی فتح نصیب فرمائے گا۔ اُس کے بعد روم[61] کے خلاف (یعنی نصاریٰ سے) جنگ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر بھی غالب کرے گا۔ پھر دجال سے لڑو گے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر بھی فتح دے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ نافع نے کہا: اے جابر بن عمرو، ہم سمجھتے ہیں کہ دجال اُس کے بعد نکلے گا، جب روم کا ملک فتح ہو جائے گا۔"[62]

---

61 اِس سے مراد قسطنطنیہ ہے، جو رومی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔

62 اِن روایتوں میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بشارتیں نقل ہوئی ہیں: ایک یہ کہ مسلمانوں کا لشکر بحری سفر کے ذریعے سے جہاد پر نکلے گا اور اُس میں حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا شامل ہوں گی۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر — قسطنطنیہ — پر جہاد کرے گا، وہ اللہ کی مغفرت کا مستحق ہو گا۔ اِن میں سے پہلی بشارت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کا پہلا لشکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اِس لشکر نے قبرص پر حملہ کیا۔ قبرص پر مسلمانوں کا قبضہ تو نہیں ہوا، لیکن اُن سے مسلمانوں کی صلح ہو گئی۔

پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں یزید بن معاویہ کی سربراہی میں لشکر روانہ کیا۔ اُس لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ کافی دن محاصرے کے بعد جب فتح حاصل نہ ہوئی تو یہ لشکر واپس چلا گیا۔

اِس کے بعد مختلف حکمرانوں نے قسطنطنیہ پر متعدد حملے کیے، مگر فتح حاصل نہ ہو سکی۔[63]

میں پوری ہوئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبرص پر حملہ کیا اور اِس مقصد کے لیے بحری سفر اختیار کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلی بحری مہم تھی۔ اِس مہم میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور اُن کے ہم راہ اُن کی اہلیہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا بھی شریک ہوئیں۔ دوسری بشارت کا ظہور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا، جب اُنھوں نے اپنے بیٹے یزید کی سربراہی میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ اِس لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا اور بالآخر فتح کے بغیر واپس آ گیا۔ اِس میں دیگر صحابۂ کرام کے علاوہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوئے اور محاصرے کے دوران میں وفات پا گئے۔ اُنھیں شہر کی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔

[63] اِس شہر کے فتح نہ ہونے کے نمایاں اسباب کو مفتی تقی عثمانی نے اپنے سفرنامے ''جہانِ دیدہ'' میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اول تو اِس شہر کا محل وقوع ایسا تھا کہ اِس کے گرد سمندری خلیجوں نے حصار سا قائم کیا ہوا تھا۔ دوسرے یہ پہاڑی علاقہ تھا، جس میں سردیوں کا موسم، خاص طور پر عرب کے صحرا نشینوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ تیسرے اِس شہر کے گرد یکے بعد دیگرے تین فصیلیں تھیں، جن میں ایک سو ستر فٹ کے فاصلے سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ہر

اِن حکمرانوں میں حضرت عمر بن عبد العزیز، ہشام بن عبد الملک، مہدی عباسی، ہارون الرشید، بایزید یلدرم اور اُس کے پوتے مراد ثانی کے نام نمایاں ہیں۔

قسطنطنیہ کی فتح کا سہرا بایزید یلدرم کے پڑپوتے محمد ثانی کے سر بندھا۔ اُس نے 26 / ربیع الاول 857ھ بہ مطابق 6 / اپریل 1453ء کو قسطنطنیہ کو محاصرے میں لیا۔ غیر معمولی اور تاریخ ساز جدوجہد کے بعد وہ 20 / جمادی الاول 857ھ بہ مطابق 29 / مئی 1453ء کو قسطنطنیہ پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اِسی بنا پر تاریخ میں سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ قسطنطنیہ کی فتح کا تاریخی پس منظر ہے۔ اِسے اگر کسی حوالے کے بغیر مجرد طور پر سامنے رکھا جائے تو ہر شخص پکار اٹھے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا مصداق یہی غیر معمولی واقعہ ہو سکتا ہے۔[64]

فصیل انتہائی مستحکم تھی، اور پہلی اور دوسری فصیل کے درمیان ایک ناقابل عبور خندق بنی ہوئی تھی جو ساٹھ فٹ چوڑی اور سو فٹ گہری تھی، اور اِس لحاظ سے یہ قلعہ دنیا کا سب سے مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ چوتھے عیسائی دنیا میں قسطنطنیہ کو جو سیاسی اور مذہبی مقام حاصل تھا، اُس کے پیش نظر اِس پر آنچ آتی دیکھ کر پوری عیسائی دنیا اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

اِن وجوہ سے مسلمانوں کے یہ بیش تر محاصرے شہر کو فتح نہ کر سکے، بعض سلاطین کے زمانے میں اہل قسطنطنیہ خراج دینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن شہر فتح نہ ہوا۔" (321)

[64] یہی عظیم الشان پس منظر ہے کہ شاعرِ مشرق نے اِس شہر کو سیکڑوں صدیوں کے کشت و خون کا حاصل قرار دیا ہے:

خطۂ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ اُمّت کی سَطوت کا نشانِ پائدار

اب اِس بات کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھیے۔

مثال کے طور پر بالفرض:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول تو ہو جاتا ہے، مگر نہ قسطنطنیہ مفتوح ہوتا ہے اور نہ دجال کا خروج ہوتا ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ حضرت مسیح آیندہ کسی موقع پر دوبارہ نازل ہوں گے اور اُس وقت دیگر واقعات رونما ہوں گے یا یہ کہا جائے گا کہ اِس نزول نے دیگر واقعات کی نفی کر دی ہے؟

اِسی طرح دجال کا خروج تو ہو جاتا ہے، مگر نہ حضرت مسیح نازل ہوتے ہیں اور نہ قسطنطنیہ مفتوح ہوتا ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ دجال بعد ازاں دوبارہ نکلے گا اور اُس موقع پر باقی دو واقعات ظاہر ہوں گے یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اِس واقعے نے دیگر دو واقعات کی نفی کر دی ہے؟

چنانچہ سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ تین واقعات میں سے فتح قسطنطنیہ کا واقعہ تو ہو جاتا ہے، مگر اُس سے متصل دو واقعات رونما نہیں ہوتے تو اُن کی نفی میں کیا امر مانع ہے؟[65]

صورتِ خاکِ حرم یہ سر زمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اِس کی ہوا
تُربتِ ایّوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت و خُوں کا حاصل ہے یہ شہر

[65] اِس کا واحد جواب یہی ہے کہ اِس میں مانع امر یہ ہے کہ اِسے امام مسلم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے قبول کیا ہے۔ اگر جواب یہی ہے تو پھر سوال ہو گا کہ علما و محدثین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے پیش کی گئی باتوں پر روایت و درایت کے لحاظ سے جرح کیوں کرتے ہیں اور ذرا بھی تردد ہو تو رد کیوں کر دیتے ہیں اور رد و قبول کے فیصلے میں بعض اوقات ایک دوسرے سے اختلاف

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ماضی، حال یا مستقبل کے کسی واقعے کا بیان اُس میں مذکور ضمنی واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر بیانِ واقعہ پر یقین کرنا ہو تو اُس کے تمام جزوی واقعات، اُن کی ترتیب اور اُن کے باہمی اتصال پر یقین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن میں سے بعض اجزا کو منہا کر دیا جائے یا اُن کی ترتیب بدل دی جائے یا اُن کی ایسی تاویل کی جائے کہ سلسلۂ اتصال ٹوٹ جائے یا اُن کے مابین ایسا زمانی بُعد تصور کر لیا جائے، جسے واقعے کا بیان قبول کرنے سے انکار کر دے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قربِ قیامت کی علامات کی نوعیت پے در پے واقعات کی ہے۔ یعنی اُن میں ایسا تعطل یا التوا تصور نہیں کیا جا سکتا، جو غیر عقلی اور غیر فطری ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الآيات خرزات منظومات في سلك، فإن يقطع السلك يتبع بعضها بعضًا. (مسند احمد، رقم 7040)

”عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قیامت کی) علامات ایک لڑی میں پروئے ہوئے منکوں کی طرح ہیں۔ گویا اگر لڑی ٹوٹ جائے تو وہ لگاتار گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خروج الآيات بعضها على إثر بعض، يتتابعن كما تتتابع الخرز في النظام. (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 4271)

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسے لڑی (ٹوٹنے) سے اُس کے منکے پے در پے گرنا شروع ہو جاتے ہیں، ایسے ہی علاماتِ قیامت

کیوں کرتے ہیں؟

یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ
نمودار ہوں گی۔“

یہ پہلا مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ علما کی اِس تاویل کو ماننے کے لیے تہذیب و تمدن کے پہیے کو ماضی کی طرف پھیرنا ہو گا۔ یعنی یہ فرض کرنا پڑے گا کہ وہ زمانہ واپس آئے گا، جب جنگیں بارودی، ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ کے بجائے نیزوں اور تلواروں سے لڑی جائیں گی۔ جدید طرز کی باقاعدہ فوج رکھنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، جس میں سپاہی ریاست کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں۔ اِس کے بجائے پرانا طریقہ واپس آ جائے گا، جب فتح کے بعد سپاہیوں میں مالِ غنیمت تقسیم کیا جاتا تھا۔[66]

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ترکیہ (Türkiye) کا شہر استنبول (قسطنطنیہ) دوبارہ رومیوں کے قبضے میں جائے گا اور اُسے دنیا میں وہی غیر معمولی مذہبی اور سیاسی مقام حاصل ہو گا، جو پندرھویں صدی عیسوی میں یا اُس سے پہلے حاصل تھا۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اِس تاویل کو ماننے کی صورت میں مذکورہ روایت یا مجموعۂ روایات کا پیشین گوئی ہونے کا مرتبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پیش گوئی اُسی صورت میں پیش گوئی قرار پاتی ہے، جب وہ مستقبل کے بارے میں متعین اور موقت خبر سے آگاہ کرے۔ چنانچہ اگر قسطنطنیہ کی فتح کا مصداق ہی متعین نہیں ہے — یعنی یہ طے ہی نہیں ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کو کتنی بار فتح کریں گے اور وہ کون سی فتح ہو گی، جس کے بعد نزولِ مسیح ہو گا — تو پھر اِس روایت کو کیسے پیشین گوئی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ مزید یہ کہ اگر روایت کے ایک واقعے، یعنی قسطنطنیہ کی فتح کا مفہوم و مصداق مبہم ہے تو پھر دیگر واقعات، یعنی نزولِ مسیح اور دجال کے خروج کے مفہوم و مصداق کو کیسے ابہام سے پاک قرار دیا جا سکتا ہے؟

---

[66] تہذیب و تمدن کی ایسی رجعتِ قہقری کائنات کی اُس ساخت سے غیر مطابق معلوم ہوتی ہے، جس پر اللہ نے اُسے تخلیق کیا ہے۔

پانچواں اشکال:

ایک روایت کے دو طرق میں نزولِ مسیح کے ذکر کا فرق

مسلم کی 'کتاب الفتن وأشراط الساعة' (فتنے اور علاماتِ قیامت) کے 'باب فی الآیات التی تکون قبل الساعة' (باب: اُن نشانیوں کا بیان جو قیامت سے قبل ہوں گی) کی اِن دو روایتوں میں قربِ قیامت کی دس علامتیں بیان ہوئی ہیں:

عن حذيفة بن اسيد الغفاری، قال: اطلع النبی صلی الله عليه وسلم علينا ونحن نتذاكر، فقال: ما تذاكرون؟ قالوا: نذكر الساعة، قال: إنها لن تقوم حتى ترون قبلها عشر آيات، فذكر الدخان، والدجال، والدابة، وطلوع الشمس من مغربها، ونزول عيسى ابن مريم صلی الله عليه وسلم، وياجوج وماجوج، وثلاثة خسوف خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزيرة العرب، وآخر ذلك نار تخرج من اليمن تطرد الناس إلى محشرهم. (رقم 7285)

"حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا: کیا باتیں کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک تم اُس سے پہلے دس نشانیاں نہیں دیکھ لو گے۔ پھر آپ نے دھوئیں کا، دجال کا، زمین کے جانور کا، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا، عیسیٰ ابنِ مریم کے نزول کا، یاجوج و ماجوج کے خروج کا، تین جگہ زمین دھنسنے —— ایک مشرق میں، دوسرے مغرب میں، تیسرے جزیرۂ عرب میں —— کا ذکر فرمایا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اِن

نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہو گی، جو لوگوں کو یمن سے نکالے گی اور ہانکتی ہوئی محشر[67] کی طرف لے جائے گی۔"

عن ابی سریحة حذيفة بن اسيد، قال: كان النبی صلی الله عليه وسلم فی غرفة، ونحن اسفل منه، فاطلع إلينا، فقال: ما تذكرون؟ قلنا: الساعة، قال: إن الساعة لا تكون حتى تكون عشر آيات: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف فی جزيرة العرب، والدخان، والدجال، ودابة الارض، وياجوج وماجوج، وطلوع الشمس من مغربها، ونار تخرج من قعرة عدن ترحل الناس. قال شعبة: وحدثنی عبدالعزيز بن رفيع، عن ابی الطفيل، عن ابی سريحة، مثل ذلك. لا يذكر النبی صلی الله عليه وسلم. وقال احدهما فی العاشرة نزول عيسى ابن مريم صلی الله عليه وسلم، وقال

"ابو سریحہ حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک (بالائی) کمرے میں موجود تھے اور ہم اُس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ہمارے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ آپ لوگ کس بارے میں بات کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی، جب تک دس نشانیاں ظاہر نہ ہوں گی: زمین کا مشرق میں دھنس جانا، زمین کا مغرب میں دھنس جانا، زمین کا جزیرۃ العرب میں دھنس جانا، دھواں، دجال، زمین کا جانور، یاجوج و ماجوج، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عدن کے کنارے سے ایک آگ کا نکلنا اور

[67] شام کے ایک مقام کا نام۔

الآخر: وریح تلقی الناس فی البحر.

(رقم 7286)

لوگوں کو ہانکتے ہوئے آگے بڑھنا۔ شعبہ کہتے ہیں کہ مجھ سے عبدالعزیز بن رفیع نے بیان کیا ہے کہ اُنھیں ابو طفیل سے اور اُنھیں ابو سریحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اِسی مضمون کی ایک روایت پہنچی ہے۔ اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کیا (یعنی موقوف حدیث بیان کی) اور (مجھے حدیث سنانے والے فرات اور عبدالعزیز)، دونوں میں سے ایک نے دسویں نشانی کے طور پر عیسیٰ ابنِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ اِن میں سے دوسرے راوی نے کہا ہے کہ (دسویں نشانی) ایک ہوا ہو گی، جو لوگوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینکے گی۔"

یہ ایک روایت ہے، جو امام مسلم تک اِن دو طریقوں سے پہنچی ہے:

1۔ امام مسلم — سفیان بن عیینہ — فرات القزاز (تبع تابعی) — ابو طفیل (تابعی) — حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ (صحابی) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

2۔ امام مسلم — عبید اللہ بن معاذ — معاذ العنبری — شعبہ — فرات القزاز (تبع تابعی) — ابو طفیل (تابعی) — حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ (صحابی) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اِن دونوں طریق کو دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ہی روایت کے مختلف طریق ہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ اِس میں قیامت کی دس علامات کا ایک ہی مضمون بیان ہوا ہے۔ ایک ہی صحابی حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے ایک ہی تابعی راوی ابو طفیل نے آگے

نقل کیا ہے۔ ابو طفیل کے بعد آگے راوی تبدیل ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابو طفیل تک تو ایک ہی سند ہے، مگر اُن سے آگے راوی الگ الگ ہو گئے ہیں اور سند تبدیل ہوئی ہے۔ ابو طفیل سے آگے دس علامات کی اِس روایت کو فرات اور شعبہ، دوراویوں نے الگ الگ روایت کیا ہے۔ اِسی بنا پر امام مسلم تک پہنچتے پہنچتے یہ ایک روایت دو راستوں سے سامنے آئی ہے۔

چنانچہ فرات القزاز کے سفیان بن عیینہ کے توسط سے پہنچنے والے بیان میں قیامت کی یہ دس علامات بیان ہوئی ہیں:

1۔ دھواں۔

2۔ دجال کا ظاہر ہونا۔

3۔ زمین کا جانور۔

4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔

5۔ نزولِ مسیح۔

6۔ یاجوج وماجوج۔

7۔ مشرق میں زمین کا دھنس جانا۔

8۔ مغرب میں زمین کا دھنس جانا۔

9۔ جزیرہ نمائے عرب میں زمین کا دھنس جانا۔

10۔ آگ جو یمن سے نکل کر لوگوں کو ہانکے گی۔

فرات القزاز کے شعبہ کے توسط سے پہنچنے والے بیان میں نو علامات بیان ہوئی ہیں:

1۔ دھواں۔

2۔ دجال کا ظاہر ہونا۔

3۔ زمین کا جانور۔

4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔

5۔ یاجوج وماجوج۔

6۔ مشرق میں زمین کا دھنس جانا۔

7۔ مغرب میں زمین کا دھنس جانا۔

8۔ جزیرہ نمائے عرب میں زمین کا دھنس جانا۔

9۔ آگ جو یمن سے نکل کر لوگوں کو ہانکے گی۔

یعنی اِس روایت میں 9 علامات بیان ہوئی ہیں اور اِن 9 میں نزولِ مسیح کی علامت شامل نہیں ہے۔ شعبہ کی یہ روایت اِن 9 نشانیوں کے بیان پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ روایت کے آغاز میں تو دس کا عدد استعمال ہوا ہے، لہٰذا وہ دس علامتیں تو پوری ہونی چاہییں۔ اِس سوال کے جواب میں شعبہ نے دو مختلف راویوں سے دو مختلف علامتیں نقل کی ہیں:

ایک راوی کے مطابق دسویں علامت نزولِ مسیح ہے۔

دوسرے راوی کے مطابق دسویں علامت ایک ہوا ہے، جو لوگوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔

اِس روایت کے مطالعے سے دو مسئلے پیدا ہوتے ہیں:

اول، اگر کسی واقعے کی دس علامتیں ہوں اور اُن میں سے ایک سب سے نمایاں اور نہایت غیر معمولی ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بیان کرنے والا راوی باقی نو تو بیان کر دے، مگر اُس ایک کو چھوڑ دے؟ ایسے موقع پر سہو یا نسیان کا شکار بالعموم کم نمایاں بات ہی ہوا کرتی ہے۔ عقلاً محال ہے کہ باقی سب باتیں بیان ہو جائیں، مگر اہم ترین بات نظر انداز ہو جائے۔ پھر جب دسویں علامت کی تحقیق کے لیے اُس راوی کے علاوہ دو مزید راویوں سے رابطہ کیا جائے تو اُن میں سے ایک اُس اہم ترین علامت کے بجائے کوئی اور علامت بتا دے۔ اِس روایت میں یہی مسئلہ سامنے آیا ہے کہ اصل روایت میں دس کے بجائے نو علامتیں بیان ہوئی ہیں اور اُن میں نزولِ مسیح کی سب سے نمایاں علامت شامل نہیں ہے۔ پھر جب دسویں علامت کے تعین کے

لیے دیگر دو راویوں سے معلوم کیا گیا ہے تو اُن میں سے ایک نے نزولِ مسیح کی علامت کے بجاے یہ علامت بتائی ہے کہ ایک ہوا نمودار ہو گی، جو لوگوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔[68]

یہی روایت امام ترمذی نے بھی سفیان بن عیینہ سے نقل کی ہے۔ اُس میں نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سفیان بن عیینہ کی جو روایت مسلم تک پہنچی ہے، اُس میں نزولِ مسیح کی علامت مذکور ہے، مگر اُنھی سفیان بن عیینہ سے جب ترمذی نے روایت لی ہے تو اُس میں نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے۔ روایت یہ ہے:

عن حذیفة بن اسید، قال: اشرف علینا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من غرفة، ونحن نتذاکر الساعة فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: لا تقوم الساعة حتی تروا	”حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمرے سے ہماری طرف رخ فرمایا۔ اُس وقت ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: قیامت

[68] استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی 'ریح تلقی الناس فی البحر' والی روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”یہ طریق اگرچہ موقوف ہے، لیکن ہمارے نزدیک دو وجوہ سے اِس کو مضمون کے لحاظ سے ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ دسویں نشانی اِسی ہوا کو سمجھنا چاہیے:

ایک اِس وجہ سے کہ نزولِ مسیح کا جو وقت آگے ایک روایت میں بیان ہوا ہے، وہ فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد تھا۔ یہ فتح 1453ء میں ہو چکی ہے۔ ہر صاحب علم اِس بات سے واقف ہے کہ اُس کے بعد اِس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

دوسرے اِس وجہ سے کہ مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو تصریحات قرآن میں وارد ہیں، اُن کے اِس نزول کو کسی طرح قبول نہیں کرتیں۔“ (علم النبی 586)

عشر آيات: طلوع الشمس من مغربها، ویاجوج وماجوج، والدابة، وثلاثة خسوف: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزيرة العرب، ونار تخرج من قعر عدن تسوق الناس او تحشر الناس،فتبيت معهم حيث باتوا، وتقيل معهم حيث قالوا. (رقم 2183)

اُس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، یاجوج وماجوج، زمین کا جانور، زمین کا تین بار دھنس جانا——ایک بار مغرب میں، ایک بار مشرق میں اور ایک بار جزیرۂ عرب میں——عدن کے اندر سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانک کر اکٹھا کرے گی، جہاں لوگ رات گزاریں گے، وہیں رات گزارے گی اور جہاں لوگ قیلولہ کریں گے، وہیں قیلولہ کرے گی۔"

چھٹا اشکال:

قربِ قیامت کی علامات کی بعض روایات میں نزولِ مسیح کا عدم ذکر

روایتوں سے یہ بات واضح ہے کہ نزولِ مسیح کا واقعہ قربِ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ اہل علم بھی اِس معاملے میں متفق ہیں۔ وہ روایتیں جن میں قربِ قیامت کی علامتیں بیان ہوئی ہیں، اُن میں سے بعض ایسی ہیں، جن میں اِن علامتوں کو گن کر بتایا گیا ہے۔ اِن میں سے بعض تین، بعض چار، بعض چھ اور بعض دس علامتوں کو بیان کرتی ہیں۔ اِن سب کو جمع کیا جائے تو مجموعی طور پر درجِ ذیل علامتیں سامنے آتی ہیں:

1۔ دھواں۔

2۔ دجال کا ظہور ہونا۔

3۔ زمین کا جانور۔

4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔

5۔ نزولِ مسیح۔

6۔ یاجوج وماجوج۔

7۔ مشرق میں زمین کا دھنس جانا۔

8۔ مغرب میں زمین کا دھنس جانا۔

9۔ جزیرہ نمائے عرب میں زمین کا دھنس جانا۔

10۔ آگ جو یمن سے نکل کر لوگوں کو ہانکے گی۔

11۔ ہوا جو لوگوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔

12۔ موت۔

13۔ 30 دجالوں کا خروج۔

14۔ عیسائی رومیوں کی اکثریت۔

اِن علامتوں پر غور کیجیے تو اِن میں سب سے غیر معمولی علامت نزولِ مسیح کی ہے۔ باقی علامتوں کے مقابل میں یہ سب سے نمایاں بھی ہے، نہایت درجہ خارقِ عادت بھی ہے اور اِس کا مفہوم و مصداق بھی پوری طرح واضح ہے۔ اِس بنا پر فطری تقاضا یہی ہے کہ اگر کوئی راوی اِن چودہ پندرہ علامتوں میں سے چند علامتوں کو بیان کرے تو اُسے اِس نمایاں ترین علامت کو ضرور بیان کرنا چاہیے۔ یہ انسانی عقل اور تجربے کے خلاف ہے کہ سب سے نمایاں بات چھوڑ کر مقابلتاً کم اہم باتیں بیان کر دی جائیں۔ اب حقیقت یہ ہے کہ علاماتِ قیامت کی متعدد روایات میں نزولِ مسیح کی علامت کو بیان نہیں کیا گیا۔

مسلم کی ایک روایت میں قیامت کی چھ علامات بیان ہوئی ہیں، مگر اُن میں نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے:

عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم، قال: بادروا بالاعمال ستًا: طلوع الشمس من مغربها، او الدخان، او الدجال، او الدابة، او خاصة احدكم، او امر العامة. (رقم7584)

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ چیزوں سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کرو: ایک سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے، دوسرے دھوئیں سے، تیسرے دجال کے نکلنے سے پہلے، چوتھے زمین کے جانور سے، پانچویں قیامت سے، چھٹے موت سے پہلے۔“

اِسی طرح بخاری کی درج ذیل روایت میں قیامت کی 11 علامتیں بیان ہوئی ہیں، مگر اِن میں نزول مسیح کا ذکر نہیں ہے:

عن ابی هريرة، ان رسول الله صلی الله عليه وسلم، قال: لا تقوم الساعة حتی تقتتل فئتان عظيمتان يكون بينهما مقتلة عظيمة، دعوتهما واحدة، وحتی يبعث دجالون كذابون قريب من ثلاثين، كلهم يزعم انه رسول الله، وحتی يقبض العلم، وتكثر الزلازل، ويتقارب الزمان، وتظهر الفتن، ويكثر الهرج: وهو القتل، وحتی يكثر فيكم المال فيفيض حتی يهم رب المال من

”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی، جب تک دو عظیم جماعتیں جنگ نہ کریں گی۔ اُن دونوں جماعتوں کے درمیان بڑی خوں ریزی ہو گی۔ حالاں کہ دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہو گا اور یہاں تک کہ کم و بیش تیس جھوٹے دجال بھیجے جائیں گے۔ اِن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے، یہاں تک کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور زلزلوں کی کثرت ہو گی

يقبل صدقته وحتى يعرضه عليه، فيقول الذى يعرضه عليه: لا ارب لى به، وحتى يتطاول الناس فى البنيان، وحتى يمر الرجل بقبر الرجل، فيقول: يا ليتنى مكانه، وحتى تطلع الشمس من مغربها، فإذا طلعت ورآها الناس، يعنى آمنوا اجمعون، فذلك حين لا ينفع نفسًا إيمانها لم تكن آمنت من قبل او كسبت فى إيمانها خيرًا ولتقومن الساعة وقد نشر الرجلان ثوبهما بينهما، فلا يتبايعانه، ولا يطويانه، ولتقومن الساعة وقد انصرف الرجل بلبن لقحته فلا يطعمه، ولتقومن الساعة وهو يليط حوضه فلا يسقى فيه، ولتقومن الساعة وقد رفع اكلته إلى فيه فلا يطعمها.(رقم 7121)

اور (قیامت کا) زمانہ قریب ہو جائے گا اور فتنے ظاہر ہو جائیں گے اور ہرج بڑھ جائے گا — ہرج سے مراد قتل ہے — تمھارے پاس مال کی کثرت ہو جائے گی، بلکہ وہ بہ پڑے گا، یہاں تک کہ صاحب مال کو اِس کی فکر ہو گی کہ اُس کا صدقہ کون قبول کرے گا۔ حالات اِس نہج تک پہنچ جائیں گے کہ وہ اپنا صدقہ لوگوں کے سامنے پیش کرے گا۔ لیکن جس کے سامنے بھی پیش کرے گا، وہ کہے گا کہ مجھے اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ بڑی بڑی عمارتوں پر آپس میں فخر کریں گے۔ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عمارتیں بنائیں گے۔ ایک شخص دوسرے کی قبر سے گزرے گا اور کہے گا کہ کاش! میں بھی اِسی جگہ ہوتا۔ سورج مغرب سے نکلے گا۔ پس جب وہ اِس طرح طلوع ہو گا تو سب ایمان لے آئیں گے، لیکن یہ وہ وقت ہو گا، جب ایمان لانا فائدہ نہ پہنچائے گا۔ پھر قیامت اچانک اِس طرح آ جائے گی کہ دو آدمیوں نے اپنے درمیان کپڑا پھیلا رکھا ہو گا اور

اُسے ابھی بیچ نہ پائے ہوں گے، نہ
لپیٹ پائے ہوں گے۔ قیامت اِس
طرح برپا ہو جائے گی کہ ایک شخص
اپنی اونٹنی کا دودھ نکال کر واپس ہوا ہو
گا اور اُسے پی بھی نہ پایا ہو گا۔ اور
قیامت اِس طرح قائم ہو جائے گی کہ
وہ اپنے حوض کو درست کر رہا ہو گا اور
اُس میں سے پانی بھی نہ پیا ہو گا۔ اور
قیامت اِس طرح قائم ہو جائے گی کہ
اُس نے اپنا لقمہ منہ کی طرف اٹھایا ہو
گا اور ابھی اُسے کھایا بھی نہ ہو گا۔"

دیکھیے، اِن گیارہ علامتوں میں دجال کی علامت کا ذکر تو ہے، مگر نزولِ مسیح کی اہم ترین علامت کا ذکر نہیں ہے۔

1۔ دو عظیم جماعتوں کی جنگ۔

2۔ متعدد دجالوں کا ظہور۔

3۔ تین دجالوں کی طرف سے نبوت کا دعویٰ۔

4۔ علم کا اٹھ جانا۔

5۔ ہرج، یعنی قتل وغارت میں اضافہ۔

6۔ مال کی کثرت۔

7۔ صدقہ قبول کرنے والوں کی کمی۔

8۔ بڑی عمارتوں پر فخر۔

9۔ عمارتیں بنانے میں مقابلہ۔

10۔ لوگوں میں موت کی خواہش۔

11۔ سورج کا مغرب سے طلوع اور اسے دیکھ کر لوگوں کا ایمان لے آنا۔

اِسی طرح ترمذی کی ایک روایت میں 3 علامتیں مذکور ہیں۔ مگر اِن میں نزولِ مسیح کی علامت شامل نہیں ہے:

عن ابي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ثلاث إذا خرجن لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ:[69] الدجال، والدابة، و طلوع الشمس من المغرب او من مغربها.(رقم 3072)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ ظاہر ہوں گی تو جو شخص پہلے سے ایمان نہ لایا ہو گا، اُسے اُس کا اُس وقت ایمان لانا فائدہ نہ پہنچا سکے گا: دجال کا ظاہر ہونا، جانور نکلنا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔“

مسندِ احمد بن حنبل کی ایک روایت میں قیامت کی چھ نشانیاں بیان ہوئی ہیں، مگر اُن میں نزولِ مسیح کی علامت شامل نہیں ہے:

عن عوف بن مالك الاشجعي قال: أتيت النبي صلى الله عليه وسلم وهو في خدر له، فقلت: أدخل؟ فقال: ادخل، قلت: أكلي؟ قال: كلك، فلما جلست قال: أمسك ستًا تكون قبل الساعة، أولهن وفاة نبيكم. قال: فبكيت، قال هشيم:

”حضرت عوف بن مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی اور عرض کیا کہ کیا میں پوری طرح اندر آ جاؤں یا دروازے کے درمیان ہی میں رہوں؟ نبی صلی اللہ

---

[69] الانعام 6:158۔

ولا أدری بأیها بدأ؟ ثم فتح بیت المقدس، وفتنة تدخل بیت کل شعر ومدر، وأن یفیض المال فیکم حتی یعطی الرجل مائة دینار فیتسخطها، وموتان یکون فی الناس کقعاص الغنم قال: وهدنة تکون بینکم وبین بنی الاصفر، فیغدرون بکم فیسیرون إلیکم فی ثمانین غایة، (وقال یعلی: فی ستین غایة)، تحت کل غایة اثنا عشر ألفًا. (رقم 23996)

علیہ وسلم نے فرمایا: پوری طرح اندر آ جاؤ۔ چنانچہ میں اندر چلا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت عمدگی کے ساتھ وضو فرما رہے تھے، مجھ سے فرمانے لگے: اے عوف بن مالک، قیامت آنے سے پہلے چھ چیزوں کو شمار کر لینا، سب سے پہلے تمھارے نبی کا انتقال ہو جائے گا، میں رونے لگا۔ ہشیم نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے سب سے پہلے کون سی علامت بیان کی، پھر بیت المقدس فتح ہو جائے گا، پھر بکریوں میں موت کی وبا جس طرح پھیلتی ہے، تم میں بھی اُسی طرح پھیل جائے گی، پھر فتنوں کا ظہور ہو گا، اور مال و دولت اتنا بڑھ جائے گا کہ اگر کسی آدمی کو سو دینار بھی دیے جائیں گے تو وہ پھر بھی ناراض رہے گا، پھر اَسی (80) جھنڈوں کے نیچے (اور یعلیٰ نے کہا کہ ساٹھ (60) جھنڈوں کے نیچے) جن میں سے ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار کا لشکر ہو گا، رومی لوگ تم سے لڑنے کے لیے آ جائیں گے۔"

قربِ قیامت کی نشانیوں کی اور روایات بھی حدیث کی کتابوں میں نقل ہیں۔ یہاں فقط یہ اشکال پیش کرنا مقصود ہے کہ قیامت کی علامات والی متعدد روایات میں حضرت مسیح کے

نزول کی علامت مذکور نہیں ہے۔ اِس سے نزولِ مسیح کا تصور محل اشکال میں آ جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ساتواں اشکال:

نزولِ مسیح کی روایتوں اور دیگر روایتوں میں بعض تضادات

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں تضاد اور تناقض نہیں ہو سکتا۔ دین کے حوالے سے آپ جو بات بھی ارشاد فرماتے ہیں، وہ من جانب اللہ ہوتی ہے، اِس لیے سہو و نسیان اور تعارض و تناقض سے پاک ہوتی ہے۔ یہ حقیقتِ واقعہ بھی ہے اور اصولِ حدیث کا مسلمہ بھی ہے۔ چنانچہ اِس طرح کی کوئی صورت سامنے آ جائے تو ہماری علمی روایت میں دو متضاد روایتوں میں سے اُس روایت کو ترجیح دی جاتی ہے، جو قرآن و سنت اور علم و عقل کی روشنی میں لائق ترجیح ہو۔ یہ ترجیح اگر ممکن نہ ہو تو حالات، زمانے اور مخاطبین کی رعایت سے توجیہ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اِس میں بھی اگر دشواری ہو تو دونوں کے بارے میں توقف کیا جاتا ہے اور اُن سے استدلال اور احتجاج سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

نزولِ مسیح کی روایتوں میں داخلی اور خارجی، دونوں پہلوؤں سے بعض ایسی چیزیں نقل ہوئی ہیں، جن سے تعارض اور تناقض کی صورت سامنے آتی ہے۔ اِن میں سے ایک نمایاں مثال یہ ہے:

نزولِ مسیح کی روایتوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ یہ قربِ قیامت کا واقعہ ہے اور اِس کی نوعیت علامتِ قیامت کی ہے۔ اِن روایتوں سے واضح ہے کہ حضرت مسیح نازل ہونے کے بعد سب سے پہلے دجال کو قتل کریں گے اور دنیا بھر سے عیسائیوں اور یہودیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ قیامت اُس وقت واقع ہو گی، جب دنیا میں صرف مسلمان ہی باقی رہ جائیں گے، عیسائیوں کا کوئی وجود نہ ہو گا۔

اب مسلم کی درجِ ذیل روایت اِس سے مختلف خبر دیتی ہے۔ اِس کے مطابق قیامت اُس وقت واقع ہو گی، جب دنیا میں عیسائیوں کی اکثریت ہو گی۔ روایت یہ ہے:

عن المستورد القرشي، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: تقوم الساعة والروم اكثر الناس، قال: فبلغ ذلك عمرو بن العاص، فقال: ما هذه الاحاديث التي تذكر عنك انك تقولها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فقال له المستورد: قلت الذي سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم قال، فقال عمرو: لئن، قلت: ذلك إنهم لاحلم الناس عند فتنة، واجبر الناس عند مصيبة، وخير الناس لمساكينهم وضعفائهم. (رقم 2898)

”مستورد قرشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: قیامت اُس وقت قائم ہو گی، جب نصاریٰ سب لوگوں سے زیادہ ہوں گے۔ یہ خبر سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو پہنچی۔ اُنھوں نے مستورد سے کہا: وہ کون سی حدیثیں ہیں، جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اِنھیں آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے؟ مستورد نے کہا: میں تو وہی کہتا ہوں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے۔ عمرو نے کہا: اگر تو یہ کہتا ہے، (تو ٹھیک ہے)، بے شک نصاریٰ فتنہ میں سب لوگوں سے زیادہ بردبار ہوتے ہیں اور جب فتنہ ٹل جائے تو وہ جلد درست ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں میں ضعیفوں اور مسکینوں کے حق میں سب سے بہتر ہیں۔“

باب چہارم

نزولِ مسیح ــــ غامدی صاحب کا موقف

گذشتہ باب میں نزولِ مسیح کے تصور پر جناب جاوید احمد غامدی کے اشکالات سامنے آ گئے ہیں۔ یہ قرآنِ مجید کے نصوص، فہم حدیث کے اصول، تاریخ کے حقائق اور علم و عقل کے مسلمات کی روشنی میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ اشکالات مانع ہیں کہ روایات میں منقول نزولِ مسیح اور اُس کے متعلقات کو متعین، محسوس اور مشہود واقعات کے طور پر قبول کیا جائے۔ اِن کے ساتھ یہ جائز نہیں ہے کہ مذکورہ تصور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے پیش کیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ اقدس سے کسی ناقابلِ اطمینان اور مشتبہ بات کو منسوب کرنا دین و ایمان کے منافی ہے۔ ایسا اقدام دنیا و آخرت، دونوں میں سنگین نتائج کا باعث ہو سکتا ہے۔

اِس کے بعد اب سوال یہ ہے کہ اگر غامدی صاحب نزولِ مسیح کے معروف تصور کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو درست نہیں سمجھتے تو کیا وہ اِس موضوع کی کثیر روایات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں؟ اِس کا جواب نفی میں ہے۔ غامدی صاحب اِس موضوع کی جملہ روایات کو اصلاً قبول کرتے ہیں، تاہم وہ اُن کی تاویل سنن ابنِ ماجہ اور بعض دوسری کتابوں میں نقل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی روشنی میں کرتے

ہیں۔[70] اِس روایت سے واضح ہے کہ نزولِ مسیح اور قتل دجال کا ذکر خود مسیح علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے موقع پر کیا تھا۔ روایت کے مطابق اسرا و معراج کے سفر کے دوران میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انبیا علیہم السلام سے ملاقات فرمائی تو وقوعِ قیامت کا موضوع بھی زیرِ بحث آیا۔ اُس موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ وہ قیامت سے پہلے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ روایت درجِ ذیل ہے:

عن عبد الله بن مسعود قال: لما كان ليلة أسرى برسول الله صلى الله عليه و سلم لقي إبراهيم وموسى وعيسى. فتذاكروا الساعة. فبدأ بإبراهيم. فسألوه عنها. فلم يكن عنده منها علم. ثم سألوا موسى. فلم يكن عنده منها علم. فرد الحديث إلى عيسى بن مريم. فقال: قد عهد إلى فيما دون وجبتها. فأما وجبتها فلا يعلمها إلا الله. فذكر خروج الدجال. قال فأنزل فأقتله. فيرجع الناس إلى بلادهم. فيستقبلهم يأجوج ومأجوج وهم من كل حدب ينسلون. فلا يمرون بماء إلا شربوه. ولا بشيء إلا

”عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے فرمایا: جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، آپ کی ملاقات سیدنا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے بھی ہوئی۔ وہ آپس میں قیامت کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا، لیکن اُنھیں اِس کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ پھر اُنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، اُنھیں بھی اِس کا علم نہیں تھا۔ اِس پر عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام سے بات کرنے کو کہا گیا تو اُنھوں نے فرمایا: مجھے قیامت کے قائم ہونے سے پہلے

[70] یہ روایت سنن ابن ماجہ کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد، جامع البیان للطبری، مسند شاشی اور مستدرک حاکم میں بھی نقل ہوئی ہے۔

أفسدوه. فيجأرون إلى الله. فأدعو الله أن يميتهم. فتنتن الارض من ريحهم. فيجأرون إلى الله. فأدعو الله. فيرسل السماء بالماء. فيحملهم في البحر. ثم تنسف الجبال وتمد الارض مد الاديم. فعهد إلي متى كان ذلك كانت الساعة من الناس. كالحامل التي لا تدري أهلها متى تفجؤهم بولادتها.[71]

(ابن ماجہ، رقم 4081)

کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ رہا اِس کے قائم ہونے کا وقت تو وہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پھر اُنھوں نے دجال کے ظہور کا ذکر کیا اور فرمایا: میں نازل ہو کر اُسے قتل کروں گا۔ اِس کے بعد لوگ اپنے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں گے۔ آگے سے اُنھیں یاجوج و ماجوج ملیں گے، جو ہر ٹیلے سے تیزی کے ساتھ اُتر رہے ہوں گے۔ وہ جس پانی کے پاس سے گزریں گے، اُسے پی جائیں گے۔ اور جس چیز کے پاس سے نکلیں گے، اُسے تباہ و برباد کر دیں گے۔ اُسی وقت لوگ اللہ سے فریاد کریں گے، اور میں بھی اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ اِنھیں تباہ کر دے۔ (چنانچہ وہ سب ہلاک ہو جائیں گے)۔ تب (ساری) زمین میں اُن کی سڑاند پھیل جائے گی۔ پھر لوگ اللہ سے فریاد کریں گے، میں بھی اللہ سے دعا کروں گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ

---

[71] حاکم اور ذہبی نے اِس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے۔ بوصیری نے اِس کے تمام راویوں کو ثقات میں شامل کیا ہے۔ بعض محدثین نے اِس کے ایک راوی موثر بن عفازہ پر جرح کی ہے، مگر ابنِ حبان اور دیگر محدثین اُنھیں ثقہ قرار دیتے ہیں (الصحیح المسبور من التفسیر بالماثور، حکمت بشیر یاسین 3/ 396)۔

آسمان سے بارش نازل فرمائے گا جو اُنھیں
بہا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ پھر
پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور
زمین کو اِس طرح کھینچ کر برابر کر دیا
جائے گا، جس طرح چمڑے کو کھینچ دیا
جاتا ہے۔ (عیسیٰ علیہ السلام نے کہا):
مجھے بتایا گیا ہے کہ جب یہ واقعہ ہو گا تو
قیامت اتنی قریب ہو گی، جیسے وہ حاملہ
جس (کا وقت بالکل قریب ہو اور اُس)
کے گھر والوں کو پتا نہ ہو کہ اچانک کس
وقت ولادت ہو جائے گی۔‘‘

استاذِ گرامی کے نزدیک یہ روایت نزولِ مسیح کی روایتوں کی الجھنوں اور اشکالات کو رفع کر دیتی ہے۔ اگر اِس روایت کو اصل اور دیگر روایتوں کو متابعات کے طور پر سمجھا جائے تو نزولِ مسیح، ظہورِ دجال، خروجِ یاجوج وماجوج اور علاماتِ قیامت کی جملہ روایتیں بہت حد تک ہم آہنگ اور ہم رنگ مضمون کے طور پر سامنے آتی ہیں اور اہل علم کے لیے اُنھیں قبول کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

یہ روایت کیونکر اصل کا مقام رکھتی ہے، دیگر روایتیں کیسے اِس کے تابع ہیں اور اِس کے مندرجات خصوصاً نزولِ مسیح کا ممکنہ طور پر کیا مدعا اور مصداق ہے؟ اِن سوالات کی وضاحت ایک مفصل کتاب کی متقاضی ہے۔ یہاں اجمالی بیان کے طور پر چند نکات پیش ہیں۔

1۔ نزولِ مسیح کے باب کی روایت

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نزولِ مسیح، ظہورِ دجال، خروجِ یاجوج وماجوج اور علاماتِ قیامت ہی کے ابواب سے متعلق ہے۔ سنن ابن ماجہ میں یہ ’فتنۃ

الدجال وخروج عیسی بن مریم وخروج یاجوج و ماجوج' کے باب میں درج ہے۔اِن موضوعات کی بعض دیگر روایتیں بھی اِس باب میں منقول ہیں۔ مزید برآں، اِس روایت میں وہ تمام امور مذکور ہیں، جو نزولِ مسیح کے تصور کا جزوِلازم ہیں اور اِس موضوع کی روایتوں میں بہ تکرار نقل ہوئے ہیں، یعنی:

* نزولِ مسیح قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔
* قیامت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے۔
* آپ کی موجودگی میں دجال کا ظہور ہو گا۔
* آپ دجال کو قتل کریں گے۔
* پھر آپ کی موجودگی ہی میں یاجوج وماجوج کا خروج ہو گا۔
* وہ ہر بلندی سے پل پڑیں گے۔
* پھر مسیح علیہ السلام اُن کی ہلاکت کی دعا کریں گے تو وہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔
* زمین اُن کی لاشوں سے بھر جائے گی۔
* پھر حضرت مسیح دعا فرمائیں گے تو زمین اُن کے وجود سے پاک ہو جائے گی۔
* اُس وقت قیامت بالکل قریب آجائے گی۔

اِن نکات سے واضح ہے کہ اِس روایت میں بالاختصار وہی باتیں بیان ہوئی ہیں، جو نزولِ مسیح کی بعض دوسری روایتوں میں بالتفصیل نقل ہیں۔ اِس ضمن کی ایک مثال حضرت نواس بن سمعان کی روایت ہے، جسے ابنِ ماجہ نے اُسی کتاب اور اُسی باب میں نقل کیا ہے، جس میں مذکورہ روایت منقول ہے۔ اِس کے تقابل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابنِ مسعود اور نواس بن سمعان رضی اللہ عنہما کی روایات ایک ہی مدعا کے دو مختلف بیانات ہیں۔ ایک میں اجمال ہے اور دوسری میں تفصیل ہے۔ دونوں میں بعض متنوع اضافے بھی ہیں، جو ایک دوسرے کے خلا پر کرتے ہیں۔ یہی معاملہ اِس موضوع کی دیگر روایتوں کا ہے۔ روایت درجِ

ذیل ہے:

سمع النواس بن سمعان الكلابي، يقول: ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الدجال الغداة، فخفض فيه ورفع، حتى ظننا انه في طائفة النخل. فلما رحنا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم عرف ذلك فينا، فقال: ما شانكم؟ فقلنا: يا رسول الله، ذكرت الدجال الغداة، فخفضت فيه ثم رفعت، حتى ظننا انه في طائفة النخل، قال: غير الدجال اخوفني عليكم، إن يخرج وانا فيكم فانا حجيجه دونكم، وإن يخرج ولست فيكم فامرؤ حجيج نفسه، و الله خليفتي على كل مسلم. إنه شاب قطط، عينه طافئة، كاني اشبهه بعبد العزى بن قطن، فمن رآه منكم فليقرا عليه فواتح سورة الكهف. إنه يخرج من خلة بين الشام، والعراق، فعاث يمينًا، وعاث شمالاً، يا عباد الله، اثبتوا. قلنا: يا رسول الله، وما لبثه في الارض؟ قال: اربعون يومًا، يوم كسنة، ويوم كشهر، ويوم كجمعة،

"نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا۔ اِس دوران میں آپ نے اپنی آواز پست بھی کی اور بلند بھی کی۔ اِس سے ہمیں خیال ہوا کہ وہ قریب ہی کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ بعد ازاں شام کے وقت ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ہمارے چہروں کو خوف زدہ دیکھ کر پوچھا: تمھیں کیا ہوا ہے؟ ہم نے کہا: یارسول اللہ، جب آپ نے دجال کا ذکر فرمایا اور اپنی آواز کو پست بھی رکھا اور بلند بھی فرمایا تو اِس سے ہمیں اندیشہ ہوا کہ دجال قریب ہی کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ (یہ سن کر) آپ نے فرمایا: مجھے تمھارے بارے میں دجال سے بڑھ کر ایک اور بات کا اندیشہ ہے۔ دجال اگر میری موجودگی میں ظاہر ہوا تو میں خود اُس کے خلاف حجت پیش کروں گا، لیکن اگر اُس کا ظہور میرے رخصت ہونے کے بعد ہوا تو

وسائر ايامه كايامكم. قلنا: يا رسول الله، فذلك اليوم الذي كسنة تكفينا فيه صلاة يوم؟ قال: فاقدروا له قدره. قلنا: فما إسراعه في الارض؟ قال: كالغيث اشتد به الريح، قال: فياتي القوم فيدعوهم فيستجيبون له، ويؤمنون به، فيامر السماء ان تمطر فتمطر، ويامر الارض ان تنبت فتنبت، وتروح عليهم سارحتهم اطول ما كانت ذرى، واسبغه ضروعًا، وامده خواصر، ثم ياتي القوم فيدعوهم فيردون عليه قوله، فينصرف عنهم، فيصبحون ممحلين ما بايديهم شيء، ثم يمر بالخربة، فيقول لها: اخرجي كنوزك، فينطلق، فتتبعه كنوزها كيعاسيب النحل. ثم يدعو رجلاً ممتلئًا شباباً، فيضربه بالسيف ضربة فيقطعه جزلتين رمية الغرض. ثم يدعوه فيقبل يتهلل وجهه يضحك. فبينما هم كذلك إذ بعث الله عيسى ابن مريم، فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين، واضعًا كفيه على

تم میں سے ہر مسلمان اُس کے خلاف حجت پیش کرے گا۔ اللہ ہر مسلمان کا محافظ ہو گا۔ (آپ نے مزید فرمایا کہ) دجال گھنگھریالے بالوں والا جوان ہو گا۔ اُس کی ایک آنکھ اندھی ہو گی۔ وہ عبدالعزیٰ بن قطن کے مشابہ ہو گا۔ تم میں سے جو شخص اُس کو دیکھے، وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات کی تلاوت کرے۔ (پھر آپ نے فرمایا): وہ شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اللہ کے بندو، تم (اُس کے مقابلے میں) ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، اُس کا زمین میں قیام کتنی مدت کے لیے ہو گا؟ آپ نے فرمایا: چالیس دن تک۔ البتہ، اِن میں سے ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا، ایک دن ایک مہینے جتنا ہو گا، اور ایک دن ایک جمعہ (یعنی سات دنوں) کی طرح ہو گا۔ باقی (37) دن عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، یہ بھی بتا دیجیے کہ جو دن ایک سال کے برابر ہو گا، کیا اُس ایک دن کی (پانچ) نمازیں کفایت کریں گی؟

اجنحة ملكين، إذا طاطا راسه قطر، وإذا رفعه ينحدر منه جمان كاللؤلؤ. ولا يحل لكافر ان يجد ريح نفسه، إلا مات ونفسه ينتهى حيث ينتهى طرفه، فينطلق حتى يدركه عند باب لد فيقتله. ثم ياتى نبى الله عيسى قومًا قد عصمهم الله، فيمسح وجوههم، ويحدثهم بدرجاتهم فى الجنة، فبينما هم كذلك، إذ اوحى الله إليه: يا عيسى، إنى قد اخرجت عبادًا لى لا يدان لاحد بقتالهم، واحرز عبادى إلى الطور. ويبعث الله ياجوج وماجوج، وهم كما قال الله: من كل حدب ينسلون. فيمر اوائلهم على بحيرة الطبرية، فيشربون ما فيها، ثم يمر آخرهم، فيقولون: لقد كان فى هذا ماء مرةً. ويحصر نبى الله واصحابه حتى يكون راس الثور لاحدهم خيرًا من مائة دينار لاحدكم اليوم، فيرغب نبى الله عيسى واصحابه إلى الله، فيرسل الله عليهم النغف فى رقابهم، فيصبحون فرسى كموت نفس واحدة. ويهبط نبى الله عيسى

آپ نے فرمایا: نہیں۔ البتہ، تم اپنے اندازے سے اُن کے اوقات مقرر کر لینا۔ پھر ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، دجال زمین میں کتنی تیزی سے چلے گا؟ آپ نے فرمایا: جس تیز رفتاری سے ہوا بادلوں کو چلاتی ہے۔ (فرمایا): وہ کچھ لوگوں کے پاس جائے گا اور اُنھیں دعوت دے گا۔ وہ اُس کی دعوت پر ایمان لائیں گے اور اُس کی تصدیق کریں گے۔ وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش ہونے لگے گی، زمین کو درخت اگانے کا حکم دے گا تو وہ درخت اگائے گی۔ شام کو اُن کے مویشی اپنی چراگاہوں سے اِس طرح لوٹیں گے کہ اُن کے کوہان لمبے، کوکھے چوڑے اور پھیلے ہوئے اور تھن دودھ سے بھرے ہوں گے۔ (فرمایا): پھر وہ دوسرے لوگوں کے پاس جا کر اپنی دعوت پیش کرے گا۔ وہ اُس کی تکذیب اور تردید کریں گے۔ جب وہ وہاں سے واپس ہو گا تو اُن لوگوں کے اموال اُس کے ساتھ چل پڑیں گے۔ صبح تک لوگ بالکل خالی ہو جائیں گے۔ پھر وہ ایک ویران زمین سے کہے گا کہ

واصحابه فلا يجدون موضع شبر إلا قد ملأه زهمهم ونتنهم ودماؤهم فيرغبون إلى الله فيرسل عليهم طيرًا كاعناق البخت، فتحملهم فتطرحهم حيث شاء الله. ثم يرسل الله عليهم مطرًا لا يكن منه بيت مدر، ولا وبر فيغسله، حتى يتركه كالزلقة، ثم يقال للارض انبتي ثمرتك، وردي بركتك، فيومئذ تاكل العصابة من الرمانة فتشبعهم، ويستظلون بقحفها، ويبارك الله في الرسل، حتى إن اللقحة من الإبل تكفي الفئام من الناس، واللقحة من البقر تكفي القبيلة، واللقحة من الغنم تكفي الفخذ. فبينما هم كذلك إذ بعث الله عليهم ريحًا طيبةً، فتاخذ تحت آباطهم فتقبض روح كل مسلم، ويبقى سائر الناس يتهارجون كما تتهارج الحمر، فعليهم تقوم الساعة.[72]

(ابن ماجہ، رقم 4075)

اپنے خزانے نکالو، اور جب لوٹے گا تو زمین کے خزانے اُس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کے سرداروں کی طرح (بہ کثرت) چل رہے ہوں گے۔ پھر وہ ایک نوجوان کو بلائے گا اور تلوار سے نشانے کے عین مطابق اُس کے دو ٹکڑے کر دے گا۔ اِس کے بعد وہ دوبارہ اُس کو بلائے گا تو وہ کھکھلاتا اور ہنستا ہوا اُس کے پاس آئے گا۔ اِسی دوران میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابنِ مریم کو بھیج دیں گے۔ وہ دمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار کے پاس نازل ہوں گے۔ وہ زرد لباس پہنے ہوں گے اور دو فرشتوں کے پروں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو یوں لگے گا کہ پانی کے قطرے (بالوں سے) ٹپک رہے ہیں۔ جب سر اٹھائیں گے تو قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ (فرمایا): اُن کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی —— اور وہ اُن کی حدِ نظر تک پہنچے گی —— وہ

---

[72] یہ روایت مسلم، رقم 7560 اور ترمذی، رقم 2240 کے تحت بھی نقل ہوئی ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی نے اِسے صحیح قرار دیا ہے۔

زندہ نہ بچے گا۔ پھر وہ دجال کا پیچھا
کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اُسے
پکڑلیں گے اور اُسے قتل کر دیں گے۔
اِس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اُن
لوگوں کے پاس آئیں گے، جنھیں اللہ
نے دجال سے بچایا ہو گا۔ وہ اُن کے
چہروں کو سہلائیں گے اور اُن کو جنت
میں اُن کے درجات سے آگاہ فرمائیں
گے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ
السلام پر وحی بھیجیں گے کہ میں نے
اپنے ایسے بندے نکالے ہیں، جن سے
لڑنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔
آپ اِنھیں بہ حفاظت طور کی طرف
لے جایئے۔ پھر اللہ تعالیٰ یاجوج و
ماجوج کو بھیجے گا، اور وہ ہر بلندی سے
نکل پڑیں گے۔ اِن کا پہلا گروہ بحیرۂ
طبریہ پر سے گزرے گا اور اُس میں
جتنا پانی ہو گا، پی لے گا۔ اِس کے بعد
اُن کا دوسرا گروہ وہاں پہنچے گا تو وہ کہے
گا کہ کیا اِس دریا میں کبھی پانی بھی تھا!
اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ
کے اصحاب طور پہاڑ پر حاضر رہیں
گے۔ اُن کے لیے اُس وقت بیل کا سر
سو اشرفیوں سے افضل ہو گا۔ (فرمایا):

پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور اُن
کے اصحاب دعا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ
یاجوج و ماجوج پر عذاب بھیجیں گے۔
اُن کی گردنوں میں کیڑا پیدا ہو گا، جس
کی وجہ سے صبح تک وہ سب ہلاک ہو
جائیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ
السلام اور اُن کے اصحاب زمین میں
اتریں گے تو زمین میں ایک بالشت
برابر جگہ خالی نہ ہو گی۔ (ہر جگہ یاجوج و
ماجوج کی لاشیں پڑی ہوں گی)۔ پھر
آپ اور آپ کے اصحاب اللہ سے دعا
کریں گے۔ چنانچہ اللہ ایسے پرندوں کو
بھیجے گا، جو بڑے اونٹوں کی گردنوں کے
برابر ہوں گے۔ وہ اُن لاشوں کو اٹھا لے
جائیں گے اور اُنھیں وہاں پھینک دیں
گے، جہاں اللہ کا حکم ہو گا۔ پھر اللہ
تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا، جو زمین
کے ہر حصے کو دھو ڈالے گی۔ زمین ایسی
صاف شفاف ہو جائے گی، جیسے حوض
ہوتا ہے۔ اِس کے بعد زمین کو حکم ہو
گا کہ اپنے پھل اگا اور اپنی برکت کو لوٹا
دے۔ (اِس کے نتیجے میں بہت بڑے
بڑے پھل پیدا ہوں گے)۔ ایک انار
ایک گروہ کے لیے کفایت کرے گا۔

اُس کا چھلکا سائبان کے برابر ہو گا۔ وہ
اُس کے سایہ میں بیٹھیں گے۔ دودھ
میں اتنی برکت ہو گی کہ ایک اونٹنی کا
دودھ انسانوں کے ایک بڑے گروہ کو
کفایت کرے گا۔ ایک گاے کا دودھ
ایک برادری کے لیے اور ایک بکری کا
دودھ ایک خاندان کے لیے کافی ہو گا۔
اِسی دوران میں اللہ تعالیٰ ایک پاک ہوا
بھیجیں گے، جو اُن کی بغلوں کے نیچے
لگے گی اور اثر کر جائے گی۔ اِس کے
نتیجے میں ہر مومن اور مسلم کی روح
قبض ہو جائے گی۔ برے اور بد ذات
لوگ باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی
طرح آپس میں لڑیں گے۔اُن لوگوں
پر قیامت قائم ہو گی۔“

حضرت نواس بن سمعان کی اِس روایت کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت کا تفصیلی بیان ہے۔

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک فہم حدیث کا ایک اہم اصول ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اِس باب کی تمام روایات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ اُس واقعے، اُس موقعے اور اُس موضوع کی تمام دستیاب تفصیلات سامنے آجائیں۔ اِس کے نتیجے میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس راوی نے کیا بات چھوڑی ہے اور کس نے اُسے بیان کیا ہے اور کہاں ابہام یا اجمال ہے اور کہاں وضوح اور تفصیل ہے۔ اِس طرح موضوع کی ممکن حد تک

جامع تصویر سامنے آ جاتی ہے۔[73] چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی مذکورہ روایت کو جب ہم نزولِ مسیح کے موضوع کی دیگر روایتوں میں شامل کرتے ہیں تو بات کی اصل حقیقت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور وہ تردداّت اور اشکالات رفع ہو جاتے ہیں، جو نزولِ مسیح کے تصور کو قبول کرنے میں مانع تھے۔

2۔ نزولِ مسیح کا رؤیا میں بیان

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت سے واضح ہے کہ نزولِ مسیح کا ذکر شبِ اسرا کے رؤیا میں ہوا ہے۔[74] اِس کے ابتدائی الفاظ 'لما کان لیلۃ أسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[73] استاذِ گرامی نے اِس امر کو "میزان" میں "مبادی تدبرِ حدیث" کے تحت "احادیثِ باب پر نظر" کے زیرِ عنوان اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

"... کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اِس باب کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے، لیکن اُسی باب کی تمام روایتوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اِس کی ایک مثال تصویر سے متعلق روایتیں ہیں۔ اِن میں سے بعض کو دیکھیے تو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تصاویر ممنوع قرار دی گئی ہیں، لیکن تمام روایتیں جمع کیجیے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ممانعت کا حکم صرف اُن تصویروں کے بارے میں ہے، جو پرستش کے لیے بنائی گئی ہوں۔ حدیث کے ذخیرے سے اِس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کسی حدیث کے مفہوم میں تردد ہو تو احادیثِ باب کو جمع کیے بغیر اُس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے۔" (66)

[74] 'اسرا' کے معنی 'لے جانے' کے ہیں۔ احادیث و آثار اور اُن کی شروح میں یہ لفظ عموماً اسرا و

وسلم لقی إبراهیم وموسی وعیسی'، ''اسرا کی رات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی'' سے اِس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نزولِ مسیح، ظہورِ دجال اور خروجِ یاجوج و ماجوج کے حوالے سے جو تفصیلات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں، اُن کا تعلق واقعاتِ اسرا و معراج سے ہے۔[75]

معراج کے دو سفروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان اسفار ہیں۔ ایک میں آپ کو مسجدِ اقصیٰ اور دوسرے میں آسمانوں پر لے جایا گیا۔ مسجدِ اقصیٰ کے سفر کا ذکر قرآنِ مجید میں اِن الفاظ میں آیا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ. (بنی اسرائیل 1:17)

''ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو ایک رات مسجدِ حرام سے اُس دور کی مسجد تک لے گئی، جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ اُس کو ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک، وہی سمیع و بصیر ہے۔''

75 حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی درجِ ذیل روایت سے بھی اِس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر اسرا کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ دجال کا ذکر بھی فرمایا تھا:

ابن عم نبيكم صلى الله عليه و سلم (ابن عباس) قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: مررت ليلة أسري بي على موسى بن عمران عليه السلام رجل آدم طوال جعد كأنه من رجال شنوءة ورأيت عيسى بن مريم مربوع الخلق إلى الحمرة والبياض سبط الرأس وأري مالكاً خازن النار والدجال في آيات أراهن الله إياه. (مسلم، رقم 165)

''تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد (ابنِ عباس رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا ہے کہ

قرآنِ مجید سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جانے اور آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرانے کا یہ واقعہ عالم رؤیا میں پیش آیا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 60 کے الفاظ 'وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ' (اور ہم نے جو رؤیا تمھیں دکھایا) سے یہی بات متعین ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ. وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا.

"تم یاد کرو، جب ہم نے (اِسی تنبیہ و تخویف کے لیے) تم سے کہا تھا کہ تمھارے پروردگار نے اِن لوگوں کو گھیرے میں لے لیا ہے (اور یہ اُس کا مذاق اڑا رہے تھے)۔ اور ہم نے جو رؤیا تمھیں دکھایا، اُس کو بھی ہم نے (اِن کے اِسی رویے کی وجہ سے) اِن لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا اور اُس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ ہم تو اِن کے انجام سے اِنھیں ڈرا رہے ہیں، لیکن یہ چیز اِن کی سرکشی ہی میں اضافہ کیے جاتی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اسرا کی رات موسیٰ بن عمران رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا، وہ گندم گوں تھے اور لمبے قد کے گٹھے ہوئے جسم کے انسان تھے، جیسے قبیلۂ شنوءہ کے مرد ہوتے ہیں۔ میں نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھی دیکھا۔ اُن کا قد درمیانہ، رنگ سرخ و سفید اور سر کے بال سیدھے تھے۔ (سفر معراج کے دوران میں) اُن بہت سی نشانیوں میں سے جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے دکھائیں، آپ کو دوزخ کا داروغہ مالک اور دجال بھی دکھایا گیا۔"

صحیح بخاری میں نقل حضرت انس بن مالک کی روایت، رقم 7079 سے اِس امر کی تائید ہوتی ہے کہ معراج کا آسمانی سفر بھی عالم رؤیا میں ہوا تھا۔ اِس کے متعلقہ جملے ملاحظہ کیجیے:

عن شریك بن عبد الله أنه قال سمعت أنس بن مالك يقول: ليلة اسری برسول الله صلى الله عليه وسلم من مسجد الكعبة انه جاءه ثلاثة نفر قبل ان يوحى إليه وهو نائم في المسجد الحرام، فقال اولهم: ايهم هو؟ فقال اوسطهم: هو خيرهم، فقال آخرهم: خذوا خيرهم، فكانت تلك الليلة. فلم يرهم حتى اتوه ليلةً اخرى فيما يرى قلبه، وتنام عينه، ـــــ ولا ينام قلبه، وكذلك الانبياء تنام اعينهم ولا تنام قلوبهم... قال: واستيقظ وهو في مسجد الحرام.

”شریک بن عبد اللہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو اُس رات کے بارے میں یہ بیان کرتے سنا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجدِ کعبہ سے لے جایا گیا۔ (وہ بیان کرتے ہیں): وحی (کا سلسلہ) شروع ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام میں سوئے ہوئے تھے کہ تین افراد (فرشتے) آپ کے پاس آئے۔ اُن میں سے ایک نے پوچھا: اِن (لوگوں) میں سے وہ کون ہیں؟ درمیان والے نے جواب دیا: وہ جو اِن (لوگوں) میں سب سے بہتر ہیں۔ آخری نے کہا: جو سب سے بہتر ہیں، بس اُنھیں لے جائیے۔ (پھر وہ تینوں واپس چلے گئے)۔ اِس رات میں بس اتنا ہی معاملہ ہوا۔ اُس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں نہیں دیکھا، یہاں تک کہ یہی (تینوں افراد) ایک دوسری رات میں (دوبارہ) آئے۔ اُس وقت آپ کی کیفیت ایسی تھی کہ

آپ کا دل دیکھ رہا تھا، مگر آپ کی
آنکھیں سو رہی تھیں۔ —— اور آپ
کا دل کبھی نہیں سوتا تھا۔ سب نبیوں کا
یہی معاملہ ہے کہ (نیند کے عالم میں
بھی) اُن کی آنکھیں تو سو جاتی ہیں، مگر
اُن کے دل کبھی نہیں سوتے... حضرت
انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
اِس کے بعد جب آپ بیدار ہوئے تو
مسجد حرام میں تھے۔"[76]

اِس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قربِ قیامت میں مسیح علیہ السلام کے نزول، دجال کے ظہور اور یاجوج وماجوج کے خروج کی جو تفصیلات مذکور ہیں، وہ اسرا و معراج کے موقعوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدات کا حصہ ہیں۔ یہ مشاہدات عالم رؤیا میں آپ کے نظر نواز ہوئے تھے۔

3۔ نبیوں کے رؤیا

اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وحی و الہام کے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، اُن میں سے ایک طریقہ خطاب اور کلام ہے۔ یعنی اللہ کی بات زبان و بیان کے پیرائے میں نبیوں تک پہنچتی ہے۔ الہامی صحائف اصلاً اِسی کا مجموعہ ہیں۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال قرآنِ مجید ہے۔ اِس میں اللہ کا کلام اللہ ہی کے الفاظ و اسالیب میں نقل ہے۔

---

[76] اسرا و معراج کے واقعات کی نوعیت اور اِس موضوع کی آیات و احادیث کی شرح و وضاحت کے لیے ہماری کتاب "اسرا و معراج" ملاحظہ کیجیے۔

تعلیم و تربیت کا دوسرا طریقہ تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ اِس میں حقائق کو مشہود اور ممثل طریقے سے دکھایا جاتا ہے۔ اِس نوعیت کے مشاہدات کبھی عالم بیداری میں کھلی آنکھوں سے دکھائے جاتے ہیں اور کبھی نیند کے عالم میں رؤیا کی صورت میں سامنے لائے جاتے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں یہ من جانب اللہ اور مبنی بر حق ہوتے ہیں۔ پہلی صورت کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سدرۃ المنتہیٰ پر حضرت جبریل علیہ السلام کے اترنے کا مشاہدہ ہے۔ دوسری صورت کی مثال اسرا و معراج کے مشاہدات ہیں۔

دوسری صورت عموماً اُن امور کے لیے ہوتی ہے، جو اپنی کامل تفہیم کے لیے حسی تجربے یا عینی مشاہدے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پروردگار سے یہ دعا کرنا کہ پروردگار، ہمیں ہماری عبادت کے طریقے دکھا، اِس بات کی درخواست ہے کہ اللہ کی طرف سے عبادت کے طریقے اُنھیں ممثل کر کے دکھا دیے جائیں۔[77]

اِس سے واضح ہے کہ پیغمبروں کے رؤیا من جانبِ اللہ اور وحی والہام کی ایک قسم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں شیطان کی کسی دراندازی یا نفس کے کسی خیال کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ

---

[77] سورۂ بقرہ کی آیت 128 میں یہ دعا ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے: 'رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا' (پروردگار، اور ہم دونوں کو تو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد سے بھی اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر فرما)۔

استاذِ گرامی نے اِس کی شرح میں لکھا ہے:

"اصل الفاظ ہیں: 'اَرِنَا مَنَاسِکَنَا'۔ اِن میں 'اَرِنَا' کے معنی 'ہمیں دکھا' کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم نے یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا ہے کہ عبادات سے متعلق جو سنن انبیا علیہم السلام نے قائم کی ہیں، اُن کی تعلیم بالعموم اِس طرح دی گئی کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن پر عمل کر کے رؤیا وغیرہ میں اُنھیں دکھا دیا۔" (البیان 1/ 130)

صادق، نفس الامر کے مطابق اور مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں اور بعض اوقات بیداری میں بہ چشم سر دیکھنے سے بھی زیادہ واضح اور آشکار ہوتے ہیں۔ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کے بارے میں لکھا ہے:

"... حضرات انبیا علیہم السلام کو جو رؤیا دکھائی جاتی ہے، وہ رویاے صادقہ ہوتی ہے۔ اِس کے متعدد امتیازی پہلو ہیں، جو ذہن میں رکھنے کے ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ رؤیاے صادقہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے، اُسی طرح کبھی رؤیا کی صورت میں بھی اُن کی رہنمائی فرماتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ رؤیا نہایت واضح، غیر مبہم اور روشن صورت میں 'کَفَلَقِ الصُّبْحِ' ہوتی ہے، جس پر نبی کو پورا شرح صدر اور اطمینانِ قلب ہوتا ہے۔ اگر اِس میں کوئی چیز تمثیلی رنگ میں بھی ہوتی ہے تو اِس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر واضح فرما دیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جہاں واقعات و حقائق کا مشاہدہ کرانا مقصود ہو، وہاں یہی ذریعہ نبی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے، اِس لیے کہ اِس طرح واقعات کی پوری تفصیل مشاہدہ میں آ جاتی ہے اور وہ معانی و حقائق بھی ممثل ہو کر سامنے آ جاتے ہیں، جو الفاظ کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ رؤیا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدہ سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اُس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دور رس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آ سکتا ہے، لیکن رؤیاے صادقہ مغالطہ سے پاک ہوتی ہے۔ آنکھ ایک محدود دائرہ ہی میں دیکھ سکتی ہے، لیکن رؤیا بہ یک وقت نہایت وسیع دائرہ پر محیط ہو جاتی ہے۔ آنکھ حقائق و معانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اِس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے، لیکن رؤیا معانی و حقائق اور انوار و تجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تجلی

الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہی، لیکن وہ اِس کی تاب نہ لا سکے۔ برعکس اِس کے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں جو مشاہدے کرائے گئے، وہ سب آپ نے کیے اور کہیں بھی آپ کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔" (تدبر قرآن 4 / 475-476)

4۔ تمثیلی مشاہدات کی تعبیر

انبیا علیہم السلام کو جو حقائق بہ چشم سر بصری نظارے کے طور پر یا بہ چشم دل رؤیاے صادقہ کے طریقے پر مشاہدہ کرائے جاتے ہیں، وہ بعض اوقات رؤیت کے عین مطابق اور بعض اوقات محتاجِ تعبیر ہوتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہو، یعنی مشاہدات اور نتائج میں عینی مطابقت ہو تو اُن کے فہم و تفہیم میں کوئی اشتباہ یا التباس پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پیغمبروں پر بھی واضح ہوتے ہیں اور اُن کے مخاطبین بھی اُنھیں بہ آسانی سمجھ پاتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ دیکھتا ہے، وہ بعینہٖ ماضی یا حال کا مشہود واقعہ ہوتا ہے یا مستقبل میں منصۂ عالم پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اِس کی مثال رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجدِ اقصیٰ کی عمارت کا بارِ دگر مشاہدہ ہے۔ یہ مشاہدہ ایک بار آپ نے شبِ اسرا میں رؤیا کے دوران میں کیا اور دوسری بار عالم بیداری میں اُس وقت کیا، جب کفار نے اُسے ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ کو جھٹلانے کے لیے اُنھوں نے آپ سے مسجدِ اقصیٰ کی عمارت کی تفصیلات پوچھیں تو اللہ نے مسجد کو آپ کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اور آپ نے براہِ راست دیکھتے ہوئے اُس کی پوری تفصیل بیان فرما دی۔

جہاں تک اُن مشاہدات کا تعلق ہے، جن کا من و عن ظہور مقصود نہیں ہوتا، وہ تعبیر و تشریح کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ بالعموم عالم رؤیا میں دکھائے جاتے ہیں۔ اِن میں کوئی منظر تمثیل و تشبیہ کے طریقے پر دکھایا جاتا ہے، جس کا مدعا و مصداق واقعی اور ظاہری نہیں، بلکہ معنوی اور مجازی ہوتا ہے۔ استاذِ گرامی کے نزدیک اِن کی نوعیت اراءت کے طریقے پر وحی

کی ہے۔ چنانچہ اِن کے ظہور کو بعینہٖ سمجھنے کے بجاے تعبیر اور تمثیل کے تعلق سے سمجھنا چاہیے۔ علاماتِ قیامت اور فتن کی روایتوں کے حوالے سے اُنھوں نے لکھا ہے:

”آثارِ قیامت اور فتن وغیرہ کے جو واقعات روایتوں میں بیان ہوئے ہیں، وہ آپ کو بتائے نہیں گئے، بلکہ دکھائے گئے تھے، عام اِس سے کہ وہ رؤیا میں دکھائے گئے ہوں یا بیداری کی حالت میں۔ چنانچہ واقعہ اور تمثیل کا جو امتزاج اِس طرح کے مشاہدات میں ملحوظ ہوتا ہے، وہ اِن کی شرح ووضاحت میں بھی لازماً ملحوظ رہنا چاہیے۔“(علم النبی 593)

قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اِس طرح کے رؤیا کا ذکر آیا ہے۔ چند مثالیں درجِ ذیل ہیں:

سورۂ صافات (37) میں بیان ہوا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں۔ اِس کی تعبیر، ظاہر ہے کہ یہ تھی کہ وہ اپنے فرزند کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ کی نذر کر دیں۔ تاہم، اُنھوں نے تعبیر کا طریقہ اختیار کرنے کے بجاے اُس پر بعینہٖ عمل کرنے کا راستہ منتخب کیا۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ اُن کی جانب سے امتثالِ امر میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے، اُس پر آخری درجے میں عمل ہو جائے۔ اللہ نے آپ کے تسلیم و رضا کے عظیم جذبے کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اُس کے ساتھ پوری محبت اور التفات کے ساتھ اِس حقیقت کو بیان فرمادیا کہ یہ رؤیا تھا اور اِس بنا پر محتاجِ تعبیر تھا، لہٰذا بعینہٖ عمل کا متقاضی نہیں تھا:[78]

---

[78] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جس اقدام نے اِس واقعے کو لافانی بنادیا، وہ یہ تھا کہ آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ رؤیا بالعموم تعبیری یا مجازی معنی کی تمثیل ہوتے ہیں، اُنھیں ظاہری اور حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جاتا، ظاہری معنی پر عمل کو ترجیح دی۔ یعنی اجتہادی خطا کی گنجایش ہی ختم کر دی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک جانب نہایت معمولی درجے میں یہ امکان تھا کہ تعبیر کا راستہ اختیار کرنے کی صورت میں اجتہادی غلطی واقع ہو سکتی ہے اور دوسری جانب عزیز از جان فرزند کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دینے کا معاملہ تھا۔ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا، اُس نے حکم کی تعمیل میں جائز اجتہادی خطا کا

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ۚ وَنَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۙ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا .... (105-103:37)

”پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ اور ہم نے اُس سے پکار کر کہا کہ ابراہیم، تم نے خواب کو سچا کر دکھایا ہے....“

حضرت یوسف علیہ السلام نے رؤیا میں سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس کی تعبیر یہ نہیں تھی کہ یہ اجرامِ فلکی آپ کے سامنے سجدہ ریز ہوں، بلکہ یہ تھی کہ آپ کے والدین اور گیارہ بھائی احتراماً آپ کے آگے جھک جائیں گے۔ قرآن سے واضح ہے کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا تو حضرت یوسف نے اِسی کو اپنے رؤیا کی تعبیر قرار دیا:

فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰى يُوۡسُفَ اٰوٰۤى اِلَيۡهِ اَبَوَيۡهِ وَقَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ. وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِيۡلُ رُءۡيَاىَ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّىۡ حَقًّا .... (یوسف 12:99-100)

”پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے، اُس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور کہا: مصر میں، اللہ چاہے تو امن چین سے رہیے۔ (اپنے گھر پہنچ کر) اُس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب بے اختیار اُس کے لیے سجدے میں جھک گئے۔ یوسف نے کہا: ابا جان، یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے، جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اُس کو حقیقت بنا دیا...۔“

امکان ہی باقی نہیں رہنے دیا۔

استاذِ گرامی کے نزدیک مستقبل کے حالات و وقائع کے بارے میں بالعموم یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اُنھیں عالم رؤیا میں تمثیل و تشبیہ کے انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات مثالوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ گویا مثال کی تجسیم ہو جاتی ہے اور وہ کبھی واقعہ کی صورت میں ممثل ہو کر سامنے آتی ہے اور کبھی واقعے کی روداد کے طور پر لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں واقعے اور مثال کا باہمی تعلق تشبیہ کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن مشاہدات کو اِن کے بعینہٖ وقوع پر محمول کرنے کے بجاے محتاجِ تعبیر سمجھا جاتا ہے۔

اِس نوعیت کے جو رؤیا قرآن و حدیث میں نقل ہوئے ہیں، اِن میں سے بعض کے تعبیری مصداقات خود قرآن و حدیث میں بیان ہو گئے ہیں اور بعض واقعاتی حقائق کے طور پر تاریخ میں ثبت ہو چکے ہیں۔[79] اب وہ کسی تعبیر و تشریح کے محتاج نہیں ہیں۔ مگر جہاں تک

---

[79] اِن کی ایک نمایاں مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ رؤیا ہے، جس میں آپ نے خود کو کھجور کے درختوں والی سرزمین کی طرف ہجرت کرتے دیکھا اور اپنی تلوار کی نوک ٹوٹنے اور پھر اُس کے سالم ہو جانے کا مشاہدہ فرمایا۔ اِس کی تعبیر یہ تھی کہ آپ یثرب تشریف لے جائیں گے، وہاں احد کا معرکہ ہو گا، جس میں مسلمانوں کو پہلے شکست اور بعد میں فتح نصیب ہو گی۔ اِن تعبیرات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ ذاتِ خود آگاہ فرمایا۔ مسلم میں ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے:

عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال: رأیت فی المنام أنی أھاجر من مکۃ إلی أرض بھا نخل فذھب وھلی إلی أنھا الیمامۃ أو ھجر فإذا ھی المدینۃ یثرب ورأیت فی رؤیای ھذہ أنی ھززت سیفًا فانقطع صدرہ فإذا ھو ما أصیب من المؤمنین یوم أحد ثم ھززتہ أخری فعاد أحسن ما کان فإذا ھو ما جاء اللہ بہ من الفتح واجتماع المؤمنین ورأیت فیھا أیضًا بقرًا واللہ خیر فإذا ھم النفر من المؤمنین یوم أحد وإذا الخیر ما جاء اللہ بہ من الخیر بعد وثواب الصدق الذی آتانا اللہ بعد یوم بدر. (رقم 2272)

انبیا کے اُن خوابوں کا تعلق ہے، جو ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے، وہ بہر حال محل تدبر ہیں۔ اہل علم و دانش اُن پر غور کر کے اُن کی تعبیر و تشریح کر سکتے ہیں۔

ایسے خوابوں کے بارے میں استاذِ گرامی کا موقف یہ ہے:

* اُنھیں انبیا کے تعبیر شدہ خوابوں کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

* اُن کی تمثیلات کا مصداق دین کے پورے علم کو سامنے رکھ کر طے کرنا چاہیے۔

* اُن کے بارے میں اپنی تحقیق و جستجو اور غور و فکر کے نتائج کو حتمی طریقے سے نہیں، بلکہ امکانی رائے کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔

* اُن میں سے جن تمثیلات کی کوئی تعبیر سمجھ میں نہ آ رہی ہو، اُن کے بارے میں غیر ضروری خیال آرائی کے بجاے اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔

چنانچہ استاذِ گرامی کے نزدیک نزولِ مسیح، ظہورِ دجال، خروجِ یاجوج و ماجوج اور آخری زمانے کے عظیم جنگی معرکوں اور فتنہ وفسادات کے بارے میں منقول روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤیاے صادقہ کا بیان ہیں۔ یہ تمثیل و تشبیہ کے اسالیب پر مبنی ہیں۔ اِن کی

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، جہاں کھجور کے درخت ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ غالباً یمامہ یا ہجر ہو گا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ مدینہ، یعنی یثرب تھا۔ اور اپنے اِسی خواب میں دیکھا کہ میں نے تلوار ہلائی تو اُس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا۔ سو یہ وہی حادثہ تھا، جو مسلمانوں کو احد کے دن پیش آیا۔ پھر میں نے دوسری مرتبہ تلوار ہلائی تو وہ جیسے پہلے صحیح سلامت تھی، اُسی طرح ہو گئی۔ یہ وہ فتح تھی، جو اللہ نے عطا فرمائی اور مسلمان (جنگ میں منتشر ہو جانے کے بعد) پھر جمع ہو گئے۔ پھر میں نے اِسی خواب میں گائیں دیکھیں اور بخدا، وہ بھی خیر ہی تھا۔ گایوں سے وہ مسلمان مراد تھے، جو احد میں (شہید ہوئے) تھے اور خیر وہی تھا، جو اللہ اِس کے بعد لایا اور وہ حقیقی اجر جو بدر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں عنایت فرمایا تھا۔“

تعبیر کرنی چاہیے اور اگر کوئی تعبیر سمجھ میں نہ آئے تو اِن کے بیان کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے اِن کے مفہوم پر توقف کرنا چاہیے۔

اُنھوں نے لکھا ہے:

”... فتن، ملاحم اور علاماتِ قیامت کے بارے میں جو کچھ روایتوں میں بیان ہوا ہے، اُس کو بھی اِسی زاویے سے دیکھنا چاہیے، اور جہاں تعبیر سمجھ میں نہ آ رہی ہو، معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے، اِس لیے کہ اِس طرح کی چیزیں بالعموم مصداق کے سامنے آجانے کے بعد ہی واضح ہوتی ہیں اور اِن سے مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ اپنے وقت ہی پر واضح ہوں۔“ (علم النبی 757)

5۔ نزولِ مسیح کی تمثیل کا مصداق

اوپر بیان کیے گئے مباحث سے درجِ ذیل باتیں پوری طرح متحقق ہو گئی ہیں:

اول، نزولِ مسیح اور اُس کی تفصیلات کا ذکر اسرا و معراج کے دوران میں ہوا ہے۔

دوم، اسرا و معراج کے واقعات عالم رؤیا میں پیش آئے تھے، لہٰذا نزولِ مسیح کی جملہ روایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤیا کا بیان ہیں۔

سوم، انبیا کے رؤیا وحی و الہام ہی کی ایک قسم ہوتے ہیں۔ یہ عین حق ہوتے ہیں، اِنھیں عام انسانی خوابوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

چہارم، یہ رؤیا عموماً تمثیل کی صورت میں ہوتے ہیں، اِس لیے صادق اور مبنی بر حق ہونے کے باوجود تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔

پنجم، محتاجِ تعبیر ہونے کا تقاضا ہے کہ اِنھیں اِن کے ظاہری مدعا پر محمول کرنے کے بجاے مجازی مدعا پر محمول کیا جائے اور بعینہٖ مصداق تلاش کرنے کے بجاے معنوی مصداق کی جستجو کی جائے۔

اِس خلاصے کے بعد اب اُس تعبیر کو سمجھ لیجیے، جو استاذِ گرامی نے نزولِ مسیح کی تمثیل کے بارے میں پیش کی ہے۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں بیان ہوا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رؤیا میں ایک مجلس کا مشاہدہ فرمایا، جس میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تشریف فرما تھے۔ اُن کے مابین وقوعِ قیامت کا سوال زیرِ بحث تھا۔[80] سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سوال ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وہ اُس کے وقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے استفسار ہوا تو اُنھوں نے کہا کہ اُنھیں اُس کے متعین وقت کا تو علم نہیں ہے، البتہ وہ اتنا جانتے ہیں کہ قیامت سے پہلے دجال کا ظہور ہو گا اور وہ اتر کر اُسے قتل کریں گے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

...فرد الحديث إلى عيسى بن مريم. فقال قد عهد إلي فيما دون وجبتها. فأما وجبتها فلا يعلمها إلا الله. فذكر خروج الدجال. قال فأنزل فأقتله. (ابن ماجہ، رقم 4081)	”... پھر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے بات کرنے کو کہا گیا تو اُنھوں نے فرمایا: مجھے قیامت کے قائم ہونے سے پہلے کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ رہا اِس کے قائم ہونے کا وقت تو وہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پھر اُنھوں نے دجال کے ظہور کا ذکر کیا اور فرمایا: میں نازل ہو کر اُسے قتل کروں گا۔“

---

[80] یہ پیغمبروں کی ذمہ داری کا اصل موضوع بھی ہے۔ اُن کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ لوگوں کو قیامت کے بارے میں خبردار کریں۔ لہٰذا اُن کی باہمی ملاقات میں یہ بالکل فطری ہے کہ قیامت کے وقت اور اُس کے قرب کی علامات کے بارے میں گفتگو ہو۔

استاذِ گرامی کے نزدیک اِس میں 'فانزل فاقتله' (میں اتروں گا اور اُسے قتل کروں گا) کے الفاظ کو اُن کے ظاہری معنی پر محمول کر کے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ مسیح علیہ السلام بہ نفس نفیس آسمان سے اتریں گے۔ اِس کے دو بنیادی وجوہ ہیں:

اولاً، قرآنِ مجید اِس امر کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ مجید میں کئی پہلوؤں سے زیرِ بحث آئی ہے، مگر موقع بیان کے باوجود اِس بارے میں ادنیٰ اشارہ بھی مذکور نہیں ہے۔ سورۂ مائدہ (5) کی آیات 116 تا 119 سے واضح ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام سے نصاریٰ کی گم راہی کے بارے میں پوچھیں گے۔ اِس کے جواب میں حضرت مسیح اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اپنی آمدِ ثانی کی صورت میں وہ اِس سے لاعلم نہیں ہو سکتے۔ پھر آلِ عمران (3) کی آیت 55 میں مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحۂ عمل بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی نزولِ مسیح کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔[81]

ثانیاً، روایتوں میں مذکور نزولِ مسیح کا متعین وقت گزر چکا ہے اور نزولِ مسیح کا واقعہ رونما نہیں ہوا ہے۔

یہ مقرر وقت 857 ہجری بہ مطابق 1453 عیسوی ہے، جو 570 سال پہلے گزر چکا ہے۔[82]

---

[81] اِن اشکالات پر تفصیلی بحث گذشتہ ابواب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

[82] مسلم، رقم 7460 میں نزولِ مسیح کا واقعہ نہایت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام عین اُس موقع پر نازل ہوں گے، جس وقت مسلمانوں کی فوج قسطنطنیہ کو فتح کر لینے کے بعد دجال کے ظہور کی خبر سن کر مدینہ کی طرف واپس پلٹے گی۔ قسطنطنیہ 29 / مئی 1453ء بہ مطابق 20 / جمادی الاول 857ھ کو فتح ہو چکا اور تاحال مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہے۔ مگر نہ دجال ظاہر ہوا ہے، نہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوئے ہیں اور نہ اُنھوں نے دجال کو قتل کیا ہے۔ اِس روایت پر تفصیلی بحث گذشتہ ابواب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اگر نزولِ مسیح کے الفاظ سے آپ کا شخصی نزول مراد ہوتا تو لازم تھا کہ اُس موقع پر دجال بھی ظاہر ہوتا اور آپ نازل ہو کر اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ مگر تاریخ کی شہادت اِس کے برخلاف ہے۔

اِن قطعی وجوہ کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ نزولِ مسیح کی پیشین گوئی کو آپ کے شخصی نزول پر محمول کیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کے نتیجے میں قرآن کی آیات پر اعتراض پیدا ہوتا اور احادیث خلافِ واقعہ ثابت ہوتی ہیں۔[83]

اِس کے بعد نزولِ مسیح کو قبول کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اِسے تمثیل مان کر اِس کی مجازی تعبیر قیاس کی جائے۔ ایسا کرنا دو وجوہ سے قرین صحت ہے:

1۔ نزولِ مسیح کا رؤیا میں ذکر۔

انبیا علیہم السلام کو مستقبل کے واقعات عموماً رؤیا میں تمثیل کے طریقے پر دکھائے جاتے ہیں۔ یہ معاملہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں دکھایا گیا۔

2۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا تمثیلی اسلوب کلام۔

انجیل سے واضح ہے کہ مسیح علیہ السلام کا طرزِ کلام تمثیلی تھا۔ وہ اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے عموماً مجاز کا اسلوب اختیار کرتے تھے۔ یعنی اپنی بات کے ابلاغ کے لیے حکایتیں بیان کرتے، مثالیں پیش کرتے اور تشبیہ و استعارے اور اشارے کنایے میں کلام فرماتے تھے۔[84]

---

83 اِس کے برعکس، اگر اِنھی دو وجوہ سے نزولِ مسیح کی روایات کو خلافِ قرآن اور خلافِ واقعہ قرار دے کر رد کر دیا جائے تو پھر وہ مواد ہی باقی نہیں بچتا، جو اِس تصور کا ماخذ ہے۔

84 اِس امر کی وضاحت انجیل کے صفحے صفحے سے ہوتی ہے۔ متی کی درجِ ذیل آیات سے اِس اسلوب کی نوعیت اور حقیقت پوری طرح نمایاں ہے:

”اُسی روز یسوع گھر سے نکل کر جھیل کے کنارے جا بیٹھا۔ اور اُس کے پاس ایسی بڑی بھیڑ جمع ہو گئی کہ وہ کشتی پر چڑھ بیٹھا اور ساری بھیڑ کنارے پر کھڑی رہی۔ اور اُس نے اُن

درجِ بالا استدلال کی بنا پر استاذِ گرامی نے نزولِ مسیح کے بیان کو تمثیل قرار دیا ہے اور قرآنِ مجید، بائیبل اور احادیث کے نظائر کی روشنی میں اِس کے مصداق کی تعیین کی ہے۔ چنانچہ اُن کا موقف ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے نازل ہونے سے آپ کا شخصی نزول نہیں، بلکہ مجازی نزول مراد ہے۔[85] یعنی جب مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اتروں گا تو اِس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ بہ نفس نفیس دوبارہ نازل ہوں گے، بلکہ یہ تھا کہ آپ کی ہدایت ——جسے نصاریٰ نے یک سر زائل کر دیا ہے—— دوبارہ ظاہر ہو گی۔ چنانچہ اُنھوں نے عبد اللہ بن مسعود کی مذکورہ روایت کی شرح میں لکھا ہے:

”قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ یہ رؤیا کے واقعات ہیں، جو محتاجِ تعبیر ہوتے ہیں۔

سے بہت سی باتیں تمثیلوں میں کہیں کہ دیکھو، ایک بونے والا بیج بونے نکلا۔... شاگردوں نے پاس آکر اُس سے کہا کہ تو اُن سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے؟ اُس نے جواب میں اُن سے کہا: اِس لیے کہ تم کو آسمان کی بادشاہی کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے، مگر اُن کو نہیں دی گئی۔... میں اُن سے تمثیلوں میں اِس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔... لیکن مبارک ہیں تمھاری آنکھیں، اِس لیے کہ وہ دیکھتی ہیں اور تمھارے کان، اِس لیے کہ وہ سنتے ہیں۔ پس بونے والے کی تمثیل سنو۔... اُس نے ایک اور تمثیل اُن کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اُس رائی کے دانے کی مانند ہے۔... اُس نے ایک اور تمثیل اُن کو سنائی کہ آسمان کی بادشاہی اُس خمیر کی مانند ہے۔... یہ سب باتیں یسوع نے بھیڑ سے تمثیلوں میں کہیں اور بغیر تمثیل کے وہ اُن سے کچھ نہ کہتا تھا۔...“(متی 13: 1-34)

85 بالکل اُسی طرح جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کو قربان کرنے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کے سجدہ ریز ہونے کے رؤیا عین حق ہونے کے باوجود مجازی مصداقات کے حامل تھے۔

چنانچہ نزولِ مسیح کی روایتوں کے باب میں اِس کی تعبیر ہم نے اُن کی ہدایت کے نزول سے کی ہے، جو قیامت کے قریب خود اُنھی کے ماننے والوں میں اِس شان کے ساتھ ظاہر ہو جائے گی کہ گویا وہ خود آسمان سے اترے اور اپنی قوم کی اصلاح کر کے چلے گئے ہیں۔"

(علم النبی 782)

اُن کے نزدیک یہ بالکل ویسی ہی تمثیل ہے، جیسی آپ نے اپنی عدالت کے بارے میں بیان فرمائی تھی۔ انجیل متی سے واضح ہے کہ اُنھوں نے بہ حیثیتِ رسول اپنی عدالت کے برپا ہونے کو بھی اپنی آمد سے تعبیر کیا تھا اور فرمایا تھا:

"جیسا نوح کے دنوں میں ہوا، ویسا ہی اِبنِ آدم (مسیح علیہ السلام) کے (دوبارہ) آنے کے وقت ہو گا۔ کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے کے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے، اُس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا۔ اور جب تک طوفان آ کر اُن سب کو بہا نہ لے گیا، اُن کو خبر نہ ہوئی۔ اُسی طرح اِبنِ آدم کا آنا ہو گا۔"

(متی 24:37-39)

6۔ نزولِ مسیح کی تمثیل کی تفہیم و تشریح

نزولِ مسیح کے باب میں استاذِ گرامی کا موقف حدیث کے الفاظ اور اُن کے مصداق کا انجیل کے درجِ بالا الفاظ اور اُن کے مصداق پر قیاس ہے۔ یعنی اُنھوں نے حدیث میں نقل "میں (عیسیٰ ابنِ مریم) نازل ہوں گا" کے الفاظ کو انجیل میں نقل "ابنِ آدم (عیسیٰ ابنِ مریم) آئے گا" کے الفاظ پر قیاس کیا ہے اور اِس کے مصداق کو بالکل اُسی طرح آپ کی مجازی آمد پر محمول کیا ہے، جیسے انجیل کی پیش گوئی کا مجازی مصداق تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔

اِس قیاس میں مقیس — نزولِ مسیح بہ معنی نزولِ ہدایتِ مسیح — اور مقیس علیہ — آمدِ مسیح بہ معنی آمدِ عدالتِ مسیح — کے باہمی تعلق کی تفہیم ضروری ہے۔ اِس مقصد کے لیے

پہلے اُس تمثیل اور اُس کے مصداق کو سمجھ لیجیے، جس پر قیاس کیا گیا ہے۔

سیدنا مسیح علیہ السلام نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ وہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ کی عدالت بن کر نازل ہوئے تھے۔ اِس حیثیت سے اُنھیں اُن پر دین کی حجت کو قائم کرنا اور اُس کے بعد آسمانی جزا و سزا کو نافذ کرنا تھا۔ قانونِ الٰہی کے مطابق اِس کی مقررہ صورت یہ تھی کہ وہ آپ پر ایمان لائیں گے تو زمین و آسمان کی برکتوں سے فیض یاب ہوں گے اور اگر انکار کریں گے تو مستوجبِ سزا ٹھیریں گے اور دنیا ہی میں خدا کے عذاب کا شکار ہو جائیں گے۔[86] بنی اسرائیل کی بد بختی کہ اُنھوں نے ایمان و اطاعت کے بجاے انکار و انحراف کا راستہ اختیار کیا۔ مسیح علیہ السلام کی غیر معمولی پیدایش، گھوارے میں معجز کلامی اور عظیم الشان

---

[86] رسولوں کی عدالت کا یہ قانون سورۂ یونس میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.(47:10)

”(اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

استاذِ گرامی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

”یہ اُسی قانون کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ نبوت و رسالت کو ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دینے سے پہلے دنیا کی تمام قوموں پر خود اُنھی کے رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔ قرآن میں اِس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔“

(البیان 2/438)

خارقِ عادت نشانیاں[87] بھی اُنھیں اعترافِ حق پر آمادہ نہ کر سکیں۔ بالآخر اُن کی حق دشمنی اور شقاوتِ قلبی بڑھتے بڑھتے اِس بدترین سطح تک پہنچ گئی کہ اُنھوں نے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔[88]

رسولوں کی قومیں جب سرکشی کی اِس انتہا کو پہنچ جائیں تو اللہ کی طرف سے اُن کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اور عذاب کے نزول کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ اِس موقع پر رسول کو قوم سے الگ کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ محفوظ کرنے کی صورت بہ شکل حیات ہجرت الی الارض بھی ہو سکتی ہے اور بہ شکلِ وفات ہجرت الی السماء بھی ہو سکتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں یہ ہجرت الی اللہ ہوتی ہے، جس کا اظہار اللہ کے اذن سے اور اُس کی مقررہ حکمتِ عملی کے مطابق ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے اِس کی تدبیر یہ ہوئی کہ اللہ نے آپ کو وفات دینے اور آپ کے جسم مبارک کو اپنی طرف اٹھا لینے کا فیصلہ کیا۔ اِس کے ساتھ ہی بتا دیا گیا کہ منکرین پر اُن کے انکار کے باعث عذاب نازل کیا جائے گا۔[89]

---

[87] چنانچہ وہ اللہ کے حکم سے مٹی کے پرندے میں پھونک مار کر اُسے جیتا جاگتا پرندہ بناتے، مادرزاد اندھے کو بینا کرتے، لاعلاج کوڑھی کو شفا دیتے، مردہ انسانوں کو زندہ کرتے اور آنے والے لوگوں کو یہ بھی بتا دیتے کہ وہ کیا کھا کر آئے ہیں اور اُنھوں نے گھر میں کیا جمع کر رکھا ہے۔

[88] یہ ویسا ہی منصوبہ تھا، جیسا حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اور اُن کے بعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُن کی قوموں نے بنایا تھا۔

[89] سنتِ الٰہی کے مطابق رسول کے منکرین پر دنیا میں جو عذاب نازل ہوتا ہے، اُسے مجموعی لحاظ سے تین صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک صورت یہ ہے کہ رسول کی قوم اصلاً شرک پر قائم ہوتی ہے۔ دعوت کے نتیجے میں اُس کی ایک معتد بہ تعداد رسول پر ایمان لے آتی ہے اور اُسے کسی سرزمین میں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ عذاب سیدنا مسیح علیہ السلام کی وفات کے چند سال بعد 70 عیسوی میں نازل ہو گیا۔ اِس کی صورت یہ ہوئی کہ رومی سلطنت نے یروشلم کو فتح کر کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اُن کی عظمت کے نشان ہیکل سلیمانی کو مسمار کر دیا گیا۔[90] ایک لاکھ تینتیس ہزار آدمی قتل ہوئے اور سڑسٹھ ہزار کو غلام بنالیا گیا۔ پورے شہر کو تباہ و برباد کر کے کھنڈر بنا دیا گیا۔ مسیح علیہ السلام کے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کی یہی وہ صورت ہے، جس کا حوالہ قرآنِ مجید میں

اِس صورت میں عذاب کا فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ صورت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بنی اسماعیل کے ساتھ پیش آئی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ رسول کی قوم اصلاً شرک پر قائم ہوتی ہے۔ دعوت کے نتیجے میں ایمان لانے والوں کی تعداد چند نفوس سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ رسول کو کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں آتا جہاں اُس کا اقتدار قائم ہو سکے۔ ایسی قوم کی عدالت اِس طرح واقع ہوتی ہے کہ رسول اور اس کے ساتھیوں کو الگ کر کے باقی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور بعض دوسری قوموں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ رسول کی قوم اصلاً توحید پر قائم ہوتی ہے۔ تاہم وہ رسول پر ایمان لانے سے انکار کر دیتی ہے۔ دعوت کے نتیجے میں ایمان لانے والوں کی تعداد اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ منکرین کو تہ تیغ نہیں کر سکتے۔ رسول اور اُس کے ساتھیوں کو کوئی دار الہجرت بھی میسر نہیں آتا۔ ایسی قوم کی عدالت اِس طرح واقع ہوتی ہے کہ اُن پر قیامت تک کے لیے ذلت اور محکومی کا عذاب نافذ ہو جاتا ہے۔ اُنھیں صفحۂ ہستی سے اِس لیے مٹایا نہیں جاتا کہ وہ اصلاً توحید سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی رسالت کے انکار کے نتیجے میں اُنھیں اِسی عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔

[90] یہ آج تک دوبارہ تعمیر نہیں ہو سکا۔ واضح رہے کہ یہود کے لیے ہیکل سلیمانی کی نوعیت وہی ہے، جو ہمارے لیے کعبۃ اللہ کی ہے۔

'وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ' (دوسری بار کا وعدہ) کے الفاظ میں آیا ہے۔ ارشاد ہے:

...فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ لِیَسُوۡٓءٗا وُجُوۡہَکُمۡ وَ لِیَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ کَمَا دَخَلُوۡہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ لِیُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِیۡرًا. (بنی اسرائیل 17:7)

"...اِس کے بعد جب دوسری بار کے وعدے کا وقت آجاتا ہے تو ہم اپنے کچھ دوسرے زور آور بندے اٹھا کھڑے کرتے ہیں، اِس لیے کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تمھاری مسجد میں اُسی طرح گھس پڑیں، جس طرح وہ پہلی بار اُس میں گھس پڑے تھے اور جس چیز پر قابو پائیں، اُس کو تہس نہس کر ڈالیں۔"

اس عذاب کے بارے میں استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

"یہ اُس تباہی کا ذکر ہے، جو مسیح علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد 70ء میں رومی بادشاہ تیتس (Titus) کے ہاتھوں یہود پر آئی۔ اِس موقع پر ہزاروں مارے گئے، ہزاروں غلام بنائے گئے، ہزاروں کو پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا اور ہزاروں ایمفی تھیئٹروں اور کلوسیموں میں لوگوں کی تفریح طبع کے لیے جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے مختلف شہروں میں بھیج دیے گئے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین نے اپنے لیے چن لیں اور یروشلم کا شہر اور اُس کی مسجد، سب زمیں بوس کر دیے گئے۔" (البیان 3/ 67-68)

یہی وہ عدالت ہے، جو بنی اسرائیل پر اللہ کے رسول حضرت مسیح علیہ السلام کے اتمام حجت کے نتیجے میں آسمان سے نازل ہوئی۔ اِسی کی خبر مسیح علیہ السلام نے اپنی آمد کی تمثیل کے پیرائے میں بیان فرمائی تھی۔ ذیل میں انجیل کا وہ مکمل اقتباس نقل ہے، جس میں حضرت مسیح نے اِس عدالت کے آنے کی پیش گوئی فرمائی ہے۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ یہود کی موجودہ

نسل ختم ہونے سے پہلے اُن کے ساتھ جزاو سزا کا وہی معاملہ ہو گا، جو قوم نوح کے ساتھ ہوا تھا اور اُس کی صورت یہ ہو گی کہ وہ خود اُس آسمانی عدالت کو لے کر آئیں گے:

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہو لیں، یہ نسل ہر گز تمام نہ ہو گی۔ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے، لیکن میری باتیں ہر گز نہ ٹلیں گی۔ لیکن اُس دن اور اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے، نہ بیٹا، مگر صرف باپ۔ جیسا نوح کے دنوں میں ہوا، ویسا ہی اِبنِ آدم کے آنے کے وقت ہو گا۔[91] کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے کے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے، اُس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا۔ اور جب تک طوفان آکر اُن سب کو بہا نہ لے گیا، اُن کو خبر نہ ہوئی۔ اُسی طرح اِبنِ آدم کا آنا ہو گا۔ اُس وقت دو آدمی کھیت میں ہوں گے، ایک لے لیا جائے گا اور دوسرا چھوڑ دیا جائے گا۔ دو عورتیں چکی پیستی ہوں گی، ایک لے لی جائے گی اور دوسری چھوڑ دی جائے گی۔ پس جاگتے رہو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تمھارا خداوند کس دن آئے گا۔ لیکن یہ جان رکھو کہ اگر گھر کے مالک کو معلوم ہوتا کہ چور رات کو کون سے پہر آئے گا تو جاگتا رہتا اور اپنے گھر میں نقب نہ لگانے دیتا۔ اِس لیے تم بھی تیار رہو، کیونکہ جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہو گا، اِبنِ آدم آجائے گا۔“ (متی 24:34-44)

انجیل کی اِس پیشین گوئی کا مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی جس نسل میں مبعوث ہوئے تھے، اُس کے ختم ہونے سے پہلے وہ دوبارہ اُس کے اندر نازل ہوں گے۔ اِس موقع پر وہ اپنے فریضۂ رسالت کی تکمیل کریں گے اور اُن پر اُن کے انکار کی سزا نافذ کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اِس پیش گوئی کے مطابق بنی اسرائیل پر اللہ کا عذاب نازل ہوا؟

---

[91] ”اِبنِ آدم“ کے الفاظ مسیح علیہ السلام نے اپنی ذات کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ چنانچہ یہاں اِبنِ آدم کی آمد سے مراد خود مسیح علیہ السلام کی آمد ہے۔

اِس کا جواب اثبات میں ہے۔70 عیسوی میں یہ عذاب اُسی طرح برپا ہوا، جس طرح پیش گوئی میں بیان ہوا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا پیش گوئی کے مصداق کے طور پر مسیح علیہ السلام نے بہ نفس نفیس نازل ہو کر بنی اسرائیل کی جزا و سزا کا فیصلہ سنایا؟

اِس کا جواب نفی میں ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ وہ خود تو تشریف نہیں لائے، مگر اُن کی عدالت کا فیصلہ رومیوں کی تلواروں کے ذریعے سے یہود پر نافذ ہوا۔[92]

یہ تاریخی شہادت اِس امر کو ثابت کرتی ہے کہ انجیل میں مذکور آمدِ مسیح کی پیشین گوئی سے مراد مسیح علیہ السلام کا شخصی نزول نہیں تھا۔ یہ آپ کی عدالت تھی، جو نوح علیہ السلام کی عدالت کی طرح آسمان سے نازل ہوئی تھی۔ فرق صرف آلاتِ عقوبت کا تھا۔ نوح علیہ السلام کی عدالت کے لیے ابر و باد کے آلاتِ سماوی استعمال ہوئے تھے اور مسیح علیہ السلام کی عدالت کے لیے شمشیر و سناں کے آلاتِ ارضی کو کام میں لایا گیا تھا۔

اِس تفصیل سے یہ بات پوری طرح متحقق ہو گئی ہے کہ انجیل میں نقل ”ابن آدم (مسیح) آئے گا“ کے الفاظ مسیح علیہ السلام کی عدالت کے آنے کی تمثیل ہیں، اِن سے آپ کی بہ نفس نفیس آمد کا مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

اِس کے بعد اب یہ جان لیجیے کہ استاذِ گرامی نے انجیل کے الفاظ اور اُن کے معنوی مصداق کی اِسی مثال پر نزولِ مسیح کی روایات کو قیاس کیا ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جیسے سیدنا مسیح کی ”عدالت کے آنے“ کے لیے ”آمدِ مسیح“ کی تمثیل بیان ہوئی ہے، اُسی طرح

---

[92] رسولوں کے انکار کی پاداش میں اللہ کے عذاب کا نزول خالص تکوینی امر ہے۔ یہ طوفانِ باد و باراں کے روپ میں ہو، کڑک، تھرتھراہٹ، بھونچال اور صوتی دھماکے کے انداز میں ہو یا انسانی افواجِ قاہرہ کی غارت گری کی صورت میں، ہر حال میں من جانبِ اللہ ہوتا اور اللہ کی غیر متبدل سنت کا مظہر ہوتا ہے۔

آپ کی ”ہدایت کے ظہور“ کے لیے ”نزولِ مسیح“ کی تمثیل اختیار کی گئی ہے۔[93] یعنی جو اسلوب انجیل کے الفاظ — 'مَجِیءُ ابْنِ الإِنْسَانِ'،[94] ”حضرت مسیح کا آنا“ اور 'یَأْتِی ابْنُ الإِنْسَانِ'،[95] ”مسیح علیہ السلام آئیں گے“ — کا ہے، وہی اسلوب روایات کے الفاظ — 'فانزل'، ”میں نازل ہوں گا“،[96] 'ان ینزل فیکم ابن مریم'،[97] ”تم میں ابن مریم نازل ہوں گے“ اور 'فیبعث اللّٰہ عیسی ابن مریم'،[98] ”اللہ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجے گا“ — کا ہے۔ اِن کا مصداق بھی بعینہٖ مجازی اور معنوی ہے۔ چنانچہ جس طرح وہاں آپ کے آنے سے آپ کی ”عدالت کا آنا“ مراد لیا گیا ہے، اُسی طرح یہاں آپ کے آنے سے آپ کی ”ہدایت کا آنا“ مراد لینا چاہیے۔

مزید یہ کہ انجیل اور روایت میں مذکور تمثیلی اسلوب کے دونوں جملے حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے صادر ہوئے ہیں۔ یعنی انجیل اور حدیث، دونوں میں اُنھی کی بات نقل ہوئی ہے۔ ایک ہی شخصیت سے صادر ہونے والے یکساں اسلوب بیان کی شہادت سے بھی استاذِ گرامی کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

---

[93] قرآنِ مجید کی روشنی میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ کا رسول اپنی قوم کے لیے دو ہی چیزیں لے کر آتا ہے: ایک ہدایت اور دوسری عدالت۔ ہدایت سے مراد حکمت و شریعت پر مبنی وہ دین ہے، جسے قوم کو لازماً قبول کرنا ہوتا ہے اور عدالت سے مراد جزا و سزا کا وہ فیصلہ ہے، جو اتمام حجت کے بعد قوم پر نافذ کر دیا جاتا ہے۔

[94] متی 24:37۔

[95] متی 24:44۔

[96] ابن ماجہ، رقم 4081۔

[97] بخاری، رقم 2222۔

[98] مسلم، رقم 7568۔

نزولِ مسیح کے مصداق کی مذکورہ بحث سے درجِ ذیل نتائج متعین ہوتے ہیں:

* روایات میں مذکور 'فأنزل فأقتله' (میں اتروں گا اور اُسے قتل کروں گا) کے الفاظ اصلاً مسیح علیہ السلام کے الفاظ ہیں، جو اُنھوں نے معراج کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیے۔

* اِن کا پیرایۂ بیان مسیح علیہ السلام کے عام اسلوب کی طرح تمثیلی ہے۔

* اِن میں سیدنا مسیح نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے، جو اُنھوں نے انجیل کے خطبے میں اختیار کیا تھا۔

* انجیل میں حضرت مسیح کی آمد کی تمثیل ہے، جس کا مصداق ثابت شدہ تاریخی حقیقت کے طور پر آپ کی عدالت کی آمد ہے۔

* روایات میں نزولِ مسیح کی تمثیل ہے، جس کا مصداق ممکنہ طور پر آپ کی ہدایت کا نزول ہے۔

7۔ 'نزولِ مسیح' بہ معنی 'نزولِ ہدایتِ مسیح'

استاذِ گرامی کے نزدیک 'نزولِ مسیح' کی تمثیل کا مصداق 'نزولِ ہدایتِ مسیح' ہے۔ اِس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیدنا مسیح کی ہدایت دو ہزار سال پہلے آ چکی ہے تو اب دوبارہ ہدایت آنے کی کیا نوعیت ہے اور اُس کی ضرورت کس بنا پر ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس سے مراد آپ کی ہدایت کی تجدید اور اُس کا احیا ہے۔ گویا یہ آپ کی ہدایت کا ظہورِ ثانی ہے۔ اِس کا وقوع اِس لیے ضروری ہے کہ آپ کی اصل ہدایت آپ کے متبعین کے فکر و عمل سے بالکل محو ہو گئی ہے۔ اُس کی جگہ ایسا مذہب اپنا لیا گیا ہے، جو آپ کی ہدایت کے بالکل برعکس ہے اور ظلم یہ ہے کہ اُسے آپ کی ہدایت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اِس طرح کا غیر معمولی حادثہ کسی اور پیغمبر کی ہدایت کے ساتھ

پیش نہیں آیا۔ اِس حادثے کے تین پہلو غیر معمولی ہیں:

ایک یہ کہ مسیح علیہ السلام کی ہدایت توحید کی اساس سے محروم کر دی گئی ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا عظیم المیہ ہے کہ توحیدِ الٰہی کے جلیل القدر علم بردار کو شرک کی مجسم علامت بنا دیا گیا ہے۔ لوگوں سے منوا لیا گیا ہے کہ — معاذ اللہ — آپ اللہ کے فرزند ہیں اور ذاتِ خداوندی کے جسمانی ظہور کے طور پر نازل ہوئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کی تصدیق شدہ شریعت کو یک سر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ وہ پیغمبر جو یہ دعویٰ لے کر اٹھا تھا کہ میں تورات کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے آیا ہوں، اُسی کی نسبت سے یہ تسلیم کرا لیا گیا کہ تورات کا تعلق صرف بنی اسرائیل سے ہے، نصاریٰ کے لیے کوئی شریعت نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر سب انسانوں کے جرائم کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اِس کے نتیجے میں آزمایش، گناہ و ثواب اور جزا و سزا کے بنیادی دینی تصورات کی معنویت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ بدترین انحرافات نصاریٰ کی شناخت بن گئے ہیں۔ اُن کے تمام فرقے بے شمار اختلافات کے باوجود اِس گم راہی پر کامل اتفاق رکھتے ہیں۔[99] اِسی وجہ سے قرآن نے اُن کے لیے 'ضال'، یعنی گم کردہ راہ کا لقب اختیار کیا ہے۔[100]

اِس تناظر میں غامدی صاحب کا قیاس یہ ہے کہ قیامت سے پہلے مسیح علیہ السلام کی ہدایت اپنی اصل صورت میں بحال ہو جائے گی۔ اِس کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ نصاریٰ میں تجدید و احیاے دین کی تحریک اٹھے، جو سینٹ پال کے وضع کردہ دین کو ختم کر کے مسیح علیہ

---

[99] کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرتھوڈاکس، تینوں کے ہاں بہت سے اختلافات ہیں، مگر اِن بنیادی انحرافات میں تینوں متفق ہیں۔

[100] المائدہ 5:77۔

السلام کے اصل دین کو از سرِ نو قائم کر دے۔[101] یہ گویا آپ کی دعوت و ہدایت کا ظہورِ ثانی ہو گا۔

اب اِس زاویے سے روایات کے مندرجات کو دیکھیے تو متعدد چیزیں مطابق قیاس محسوس ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

* صلیب توڑ دی جائے گی۔

صلیب تثلیث کی نشانی اور شرک کی سب سے بڑی علامت ہے۔ مسیح علیہ السلام کی ہدایت اگر دوبارہ ظاہر ہوتی ہے تو لازم ہے کہ صلیب کو اُس کے تمام تصورات سمیت پاش پاش کر دیا جائے گا۔

* خنزیر کو قتل کر دیا جائے گا۔

خنزیر اصل میں ممنوعاتِ شریعت کی نشانی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جب تورات کی شریعت کو نافذ کیا تو نصاریٰ کے لیے وہ تمام قوانین واجب العمل ہو گئے، جو بنی اسرائیل کے لیے مشروع تھے۔ مگر سینٹ پال نے اُنھیں بنی اسرائیل کے ساتھ خاص قرار دے کر نصاریٰ کو اُن کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اِس کے نتیجے میں خنزیر کی حرمت اور دیگر شرعی قوانین کالعدم ہو گئے۔ گویا خنزیر زندہ ہو گیا۔ یعنی حرام کی گئی چیزیں حلال ہو گئیں۔ اب اگر تجدیدِ ہدایت کی صورت میں اصل قانون بحال ہو گا تو لازماً خنزیر کو حرام ٹھہرایا جائے گا۔ اِسی کو اُس کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔

* مسلمانوں اور نصاریٰ میں مخاصمت ختم ہو جائے گی۔

یہ بھی بدیہی امر ہے۔ جب نصاریٰ اصل ہدایت پر واپس آ جائیں گے اور تثلیث کے

---

[101] امتِ مسلمہ میں بھی دین کی تجدید و احیا کے کام گاہے بہ گاہے ہوتے رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے مصلحین اور متجددین پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے امت کو انحرافات سے نکال کر صحیح راستے پر گام زن کیا ہے۔ ماضی میں اِس کی مثال امام ابنِ تیمیہ اور حال میں امام حمید الدین فراہی ہیں۔

عقیدے سے تائب ہو کر توحید کو اختیار کر لیں گے تو اُن کے اور مسلمانوں کے مابین جنگ و جدل کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ اِس کے بعد اُن کا ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر دجال اور اُس کے معاون و انصار یہود سے بر سر پیکار ہونا قابل فہم ہے۔

روایات کی باقی پیش گوئیوں کو بھی اِسی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

باب پنجم

غامدی صاحب کے موقف پر سوالات

خاتمۂ کلام کے طور پر اُن سوالات سے تعرض ضروری ہے، جو علما کے موقف کے تقابل میں غامدی صاحب کے موقف پر پیدا ہوتے ہیں۔

اِن میں پہلا سوال یہ ہے کہ امت کے جلیل القدر علما اور مفسرین قرآنِ مجید کی جن آیات سے حیاتِ مسیح کا تصور اخذ کرتے ہیں، اُن کی تفسیر میں غامدی صاحب کا کیا موقف ہے؟ اگر اُن کا موقف مختلف ہے تو اُس کے استدلال کی کیا تفصیل ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے کے بارے میں غامدی صاحب کی اپنے استاذ امام امین اصلاحی سے اختلاف کی کیا نوعیت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اصولِ تفسیر میں اتفاق کے باوجود اِس موضوع پر اختلاف پیدا ہوا ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا سبب ہے کہ غامدی صاحب نزولِ مسیح اور اِس نوعیت کے دیگر اخبار و اطلاعات کو علی الاطلاق ایمانیات میں شامل کرنے کو درست قرار نہیں دیتے؟

اِن سوالات پر درجِ ذیل عنوانات کے تحت تفصیلی مباحث پیش ہیں:

1۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' سے مراد

2۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ'—مولانا اصلاحی کی تفسیر

3۔ 'وَرَافِعُكَ اِلَیَّ' کا مفہوم

4۔ 'قَبْلَ مَوْتِهٖ' سے مراد

5۔ 'وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ' کا مصداق

6۔ کیا نزولِ مسیحؑ کا تصور ایمانیات میں شامل ہے؟

1۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ' سے مراد

جناب جاوید احمد غامدی نے سورۂ آلِ عمران (3) کی آیت 55 میں 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' (میں تجھے وفات دوں گا) کو موت کے معنی میں لیا ہے۔ اُن کے نزدیک اِس آیت کے لفظوں کے معنی، اِس کے جملوں کی تالیف، اِس کا سیاقِ کلام اور قرآن میں اِس کے نظائر و شواہد، سب اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں 'توفی' وفات کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اِسے 'پورا لے لینے' کے معنی پر محمول کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔[102] چنانچہ اُن کی تفسیر "البیان" میں مذکورہ مقام کے ترجمے کے الفاظ یہ ہیں:

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ. اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ

"اور بنی اسرائیل نے (عیسیٰ ابن مریم کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں، اور اللہ نے بھی (اِس کے جواب میں) خفیہ تدبیر کی اور ایسی

[102] اِس سے واضح ہے کہ غامدی صاحب اور علما کے مابین 'توفی' کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے۔ غامدی صاحب اِس سے موت مراد لیتے ہیں اور علماے کرام اِسے پورا وصول کر لینے کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.(3:54-55)

تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا، جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

’توفی‘ کے معنی

’توفی‘ وفا (و ف ی) کے باب تفعل سے ہے۔ اپنے بنیادی معنی کے لحاظ سے یہ ’اخذ الشیء وافیًا‘ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس کا مطلب کسی چیز کو بہ تمام و کمال قبضے میں لے لینا ہے۔[103] موت کے مفہوم میں اِسے مجازی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

مفسرین کے نزدیک یہاں یہ لفظ اپنے مجازی مفہوم میں نہیں، بلکہ بنیادی مفہوم میں

103 ’مُتَوَفِّيْ‘ اِسی سے اسم فاعل ہے۔ ’اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ‘ میں اِس کا فاعل اللہ ہے جو ’اِنِّيْ‘ کے الفاظ میں مضمر ہے۔ ’كَ‘ کی ضمیر مخاطب اِس کا مفعول ہے، جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔

استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اِس کا مطلب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت دینا نہیں، بلکہ اُنھیں سالم اور سموچا تحویل میں لے لینا ہے۔ موت کے مجازی مفہوم میں استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جملہ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' تک محدود نہیں ہے، اِس کے بعد 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ الفاظ مانع ہیں کہ 'توفی' کو موت کے معنی پر محمول کیا جائے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موت کی صورت میں روح و بدن پر مشتمل وہ وجود ہی باقی نہیں رہتا، جس پر رفع، یعنی اٹھانے کا فعل موثر ہو سکتا ہے۔ اِس صورت میں 'ك' کی مفعولی ضمیر بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ اُس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جو زندگی کی صورت میں تو عیسیٰ علیہ السلام رہتے ہیں، مگر موت کی صورت میں اُن کا ذاتی تشخص باقی نہیں رہتا، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح اور عیسیٰ علیہ السلام کے جسد کے دو علیحدہ اجزا میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مزید برآں، سورۂ نساء (4) کی آیت 157 میں 'وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ' کے الفاظ بھی آپ کی موت کی تردید کرتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل نہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ صلیب دے کر مار سکے۔ قتل اور صلیب دینے کی یہ نفی درحقیقت موت کی نفی کے مترادف ہے۔ کلام میں اگر موت کے وقوع کی اِس زوردار انداز سے نفی کی گئی ہے تو پھر ممکن نہیں کہ 'توفی' کے لفظ کو موت کے مجازی مفہوم پر محمول کیا جائے۔

یہ 'توفی' کے معنی کی تعیین میں علما کے دلائل کا خلاصہ ہے۔[104]

جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک 'توفی' یہاں صریح طور پر وفات کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اِسے پورا لے لینے کے معنی پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ اُن کے دلائل درج ذیل ہیں۔

اولاً، زبان کا مسلمہ ہے کہ الفاظ و اسالیب کے مفہوم کا تعین اُن کے معروف اور مستعمل

---

[104] اِن دلائل کی تفصیل باب دوم میں ''نزول مسیح —— علما کا موقف'' کے زیرِ عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

معنی سے ہوتا ہے۔ کسی جملے میں استعمال ہونے والے لفظوں کے مفہوم کی تعیین ہمارے ذوق، ہماری ترجیح یا ہمارے انتخاب پر منحصر نہیں ہوتی — کہ لغت کے متنوع معانی میں سے اپنی پسند کا معنی چن کر اُسے لفظ پر چسپاں کر دیں — اِس کا انحصار سر تا سر عرفِ عام میں اُس کے استعمال پر ہوتا ہے۔[105] اِسی طرح اِس امر کا فیصلہ کہ فلاں سیاق و سباق اور فلاں اسلوب بیان میں لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے یا مجازی معنی میں، ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اِس کا تعین بھی عرفِ عام سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "انتقال کرنا" اور "منتقل ہونا" ایک ہی مادے پر مبنی مترادفات ہیں۔ دونوں کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے ہیں۔ لیکن "فلاں صاحب انتقال کر گئے" اور "فلاں صاحب منتقل ہو گئے" کا مفہوم یکساں نہیں ہے۔ پہلا جملہ قطعی طور پر موت کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے، اِس سے دنیا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا جملہ موت کا مفہوم اخذ کرنے میں مانع ہے، لازم ہے کہ اُسے دنیوی زندگی کی کسی منتقلی پر محمول کیا جائے۔ یہ اِن جملوں کا معروف معنی ہے۔ اگر کسی واضح قرینے کے بغیر اِنھیں عرف سے ہٹا کر کوئی اور معنی طے کیا جائے گا تو وہ متکلم کے مدعا کے بالکل خلاف ہو گا۔

چنانچہ 'توفی' کے معنی کا تعین لغت میں اِس کے مختلف معنی دیکھ کر نہیں، بلکہ جملے میں اِس کا استعمال دیکھ کر کیا جائے گا۔ یہ دیکھا جائے گا کہ جب اِس فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان ہو تو زبان کے عرف کے مطابق اِسے حقیقی معنی پر محمول کیا جاتا ہے یا مجازی معنی پر؟

---

[105] تاہم، یہ واضح رہے کہ لغت — خواہ وہ زبانوں پر جاری ہو یا فرہنگ میں مرتب ہو — اصلاً عرف ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی اِس امر کا تعین عرف ہی کرتا ہے کہ فلاں لفظ کن کن معانی میں مستعمل ہے، یہ معانی کن کن اسالیب کے ساتھ مخصوص ہیں، کلام کے کون سے قرائن اِن معانی کو مجاز کے ساتھ اور کون سے حقیقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور اِن میں سے کون سے معانی معروف اور متداول ہیں اور کون سے شاذ، غریب اور خلافِ قیاس ہیں۔

زبان کا عرف جو فیصلہ کرے گا، اُسی کو قبول کیا جائے گا۔

ثانیاً، جب کوئی فعل کسی جملے میں استعمال ہو تو اُس کے مفہوم کا تعین اُس کے منسوب الیہ یا مسند الیہ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ یعنی اُس لفظ کی بنا پر ہوتا ہے، جس کی طرف وہ فعل منسوب ہو یا مُسند ہو۔ ہر فعل فاعل اور مفعول سے منسوب ہوتا ہے۔ یعنی وہ فعل کسی فاعل سے صادر ہو گا اور کسی مفعول پر واقع ہو گا۔

اب، ظاہر ہے کہ فاعلوں میں بھی تنوع ہوتا ہے اور مفعول بھی مختلف ہوتے ہیں، اِس تناظر میں سوال یہ ہے کہ اگر ایک فعل کا فاعل یا مفعول تبدیل ہو جائے تو کیا اُس کے نتیجے میں اُس فعل کا مفہوم بھی تبدیل ہو سکتا ہے تو اِس کا جواب اثبات میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جملے میں استعمال ہونے والے فعل کا مفہوم مجرد اُس فعل کی بنا پر طے نہیں ہو گا، بلکہ اُن نسبتوں کی بنا پر طے ہو گا، جن سے وہ فعل منسوب ہے۔

تفہیم مدعا کے لیے اردو زبان میں روز مرہ استعمال کا ایک عام فعل ـــــ اٹھانا ـــــ بہ طورِ مثال درج ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ فعل ایک ہی ہے، مگر اپنے منسوب الیہ ـــــ فاعل یا مفعول ـــــ کی تبدیلی سے اُس کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔

1۔ لڑکے کو ماں نے اٹھالیا ہے۔ (یعنی گود میں اٹھالیا ہے۔ حقیقی معنی)

2۔ لڑکے کو اللہ نے اٹھالیا ہے۔ (یعنی موت دے دی ہے۔ مجازی معنی)[106]

3۔ لڑکے نے سامان سر پر اٹھالیا ہے۔ (یعنی چیزیں سر پر رکھ لی ہیں۔ حقیقی معنی)

---

[106] لڑکا بہ طورِ مفعول چند مزید مثالیں: 1۔ کھلاڑیوں نے لڑکے کو اٹھالیا ہے۔ (یعنی کندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ حقیقی) 2۔ پولیس نے لڑکے کو اٹھالیا ہے۔ (یعنی گرفتار کر لیا ہے۔ مجازی) 3۔ غنڈوں نے لڑکے کو اٹھالیا ہے۔ (یعنی اغوا کر لیا ہے۔ مجازی) 4۔ بہن نے لڑکے کو اٹھالیا ہے۔ (یعنی نیند سے جگا لیا ہے۔ مجازی)

4۔ لڑکے نے آسمان سر پر اٹھالیا ہے۔(یعنی اودھم مچا دیا ہے۔ مجازی معنی)[107]

اِن جملوں میں ''اٹھانا'' کا ایک ہی فعل استعمال ہوا ہے اور اِس کے لیے صلہ بھی ایک ہی ''لینا'' آیا ہے۔[108] مگر فقط فاعل یا مفعول کی تبدیلی سے اِس کے معنی بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم سنیں گے کہ ''اُس نے آسمان سر پر اٹھالیا ہے'' تو ''سامان سر پر اٹھالیا ہے'' کے اسلوب کو دلیل بنا کر یہ معنی اخذ نہیں کریں گے کہ اُس نے آسمان کو اُسی طرح سر پر رکھا ہے، جیسے سامان کو سر پر رکھا جاتا ہے۔ اِسی طرح یہ سن کر کہ ''اللہ نے لڑکے کو اٹھالیا ہے'' یہ نہیں سمجھیں گے کہ اللہ نے اُسے زندہ و سلامت آسمان پر منتقل کر لیا ہے، بلکہ یہ سمجھیں گے کہ اللہ نے اُسے موت دے دی ہے۔ اِس پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے گا کہ

---

[107] لڑکا بہ طورِ فاعل چند مزید مثالیں: 1۔ لڑکے نے قدم اٹھالیا ہے۔(یعنی فیصلہ کر لیا ہے۔ حقیقی اور مجازی) 2۔ لڑکے نے بیڑا اٹھالیا ہے۔(یعنی عزم کا اظہار کیا ہے۔ مجازی) 3۔ لڑکے نے ہاتھ اٹھالیا ہے۔(یعنی دست بردار ہو گیا ہے۔ مجازی) 4۔ لڑکے نے حلف اٹھالیا ہے۔(یعنی ذمہ داری لینے کا عہد کر لیا ہے۔ مجازی) 5۔ لڑکے نے قرآن اٹھالیا ہے۔(یعنی قرآن کی قسم کھالی ہے۔ حقیقی اور مجازی) 6۔ لڑکے نے ہتھیار اٹھالیا ہے۔(یعنی حملہ آور ہو گیا ہے۔ حقیقی اور مجازی) 7۔ لڑکے نے اُسے سر آنکھوں پر اٹھالیا ہے۔(یعنی آؤ بھگت کی ہے۔ مجازی) 8۔ لڑکے نے اُسے ہاتھوں پر اٹھالیا ہے۔(یعنی ناز نخرے اٹھائے ہیں۔ مجازی) 9۔ لڑکے نے پہرہ اٹھالیا ہے۔(یعنی ناکہ بندی ختم کر دی ہے۔ مجازی) 10۔ لڑکے نے قرض اٹھالیا ہے۔(یعنی ادھار پیسے پکڑ لیے ہیں۔ مجازی) 11۔ لڑکے نے بہت رنج اٹھالیا ہے۔(یعنی بہت برداشت کر لیا ہے۔ مجازی) 12۔ لڑکے نے کافی تجربہ اٹھالیا ہے۔(یعنی کسی کام کو سیکھ لیا ہے۔ مجازی) 13۔ لڑکے نے کافی نقصان اٹھالیا ہے۔(یعنی نقصان برداشت کر لیا ہے۔ مجازی)

[108] یعنی صلہ مختلف ہو گا تو معانی کا مزید تنوع سامنے آ جائے گا۔ ''اٹھا رکھا ہے''، ''اٹھا دیا ہے''، ''اٹھایا ہے'' کے اسالیب پر غور کر کے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''ماں نے لڑکے کو اٹھالیاہے'' کے جملے میں بھی تو وہی فعل اور وہی اسلوب اختیار ہوا ہے تو وہاں کیوں زندہ گود میں اٹھانے کا مفہوم لیاجارہاہے؟ اِس پر یہی کہاجائے گا کہ اِس استدلال کا زبان وبیان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ثالثاً، یہ امر مسلمہ ہے کہ 'توفیٰ' کا فعل مختلف نسبتوں کے ساتھ مختلف معانی پر محمول ہوتا ہے۔ صاحبِ ''اقرب الموارد'' نے اِس کی چار نمایاں نسبتیں بیان کی ہیں۔

1۔ اِس فعل کے ساتھ اگر کوئی امر بہ طورِ مفعول آئے تو اِس کے معنی 'أخذ الشیء وافیًا' یا 'أخذ الشی بتمامه'، یعنی کسی چیز کو پورا لے لینے کے ہوں گے:

توفی حقه توفیًا: اخذه وافیًا. ویقال توفیت من فلان ما لی علیه. (1472)

''اُس نے اپنا پورا حق لے لیا، یعنی اُس نے اُس شے (حق) کو مکمل طور پر لے لیا۔ (مثلاً) یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے فلاں سے وہ سب لے لیا، جو میرا اُس پر حق بنتا تھا۔''

2۔ اگر لفظِ ''مدت'' اِس کا مفعول ہو تو اِس کے معنی مدت کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے ہوں گے:

وتوفیٰ المدة: بلغها واستکملها. (1472)

'''توفیٰ المدة' کا مطلب ہے کہ وہ مدت کو پہنچ گیا یا اُس نے مدت کو مکمل کر لیا۔''

3۔ اگر اِس کا مفعول ''عدد القوم'' آجائے تو اِس سے مراد لوگوں کو پوری طرح شمار کر لینا ہوگا:

توفی عدد القوم: عدهم کلهم. (1472)

'''توفیٰ عدد القوم'، یعنی اُس نے سب کے سب لوگوں کو شمار کر لیا۔''

4۔ 'توفیٰ' کے اِس فعل کا فاعل جب اللہ ہو اور مفعول انسان ہو تو اِس کے معنی یہ ہوں

گے کہ اللہ نے اُس انسان کی روح کو قبض کر لیا، یعنی اُسے موت دے دی:

توفی اللّٰہ زیدًا : قبض روحه (تُوُفِّیَ) فلان مجهولاً: قبضت روحه ومات. فاللّٰہ المتوفی والعبد المتوفی. (1472)

''توفی اللّٰہ زیدًا'': یعنی اللہ نے زید کی روح کو قبض کر لیا اور وہ مر گیا۔ یہ فعل جب مجہول ہو گا تو اِس کے معنی ہوں گے کہ فلاں کی روح قبض کر لی گئی اور وہ مر گیا۔ اللہ قبض کرنے والا ہو گا اور بندہ قبض ہونے والا ہو گا۔''

''اقرب الموارد'' کی پوری عبارت درج ذیل ہے:

(توفی) حقه توفیًا: أخذہ وافیًا، مطاوع وفی ویقال 'توفیت من فلان ما لی علیه' والمدة: بلغها واستکملها وعدد القوم: عدهم کلهم وفی التاج عدهم لهم و اللّٰہ زیدًا: قبض روحه (تُوُفِّیَ) فلان مجهولاً: قُبِضَت روحه ومات، فاللّٰہ المتوفی والعبد المتوفی. (1472)

''''اُس نے اپنا پورا حق لے لیا'' یعنی اُس نے اُس شے (حق) کو مکمل طور پر لے لیا۔ (مثلاً) یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے فلاں سے وہ سب لے لیا، جو میرا اُس پر حق بنتا تھا۔ 'توفی المدة' کا مطلب ہے کہ وہ مدت کو پہنچ گیا یا اُس نے مدت کو مکمل کر لیا۔ 'توفی عدد القوم'، یعنی اُس نے سب کے سب لوگوں کو شمار کر لیا۔ 'توفیٰ اللّٰہ زیدًا': یعنی اللہ نے زید کی روح کو قبض کر لیا اور وہ مر گیا۔ یہ فعل جب مجہول ہو گا تو اِس کے معنی ہوں گے کہ فلاں کی روح قبض کر لی گئی اور وہ مر گیا۔ اللہ قبض کرنے والا ہو گا اور بندہ قبض ہونے والا ہو گا۔''

رابعاً، اِس تناظر میں اب آیت کے الفاظ دیکھیے۔ ارشاد ہے:

...یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ.... (آل عمران 3:55)

"... اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا...۔"

'اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ' کے جملے میں صاف واضح ہے کہ یہاں 'توفی' کا فعل استعمال ہوا ہے، جس کا فاعل 'اِنِّیۡ' کی ضمیر متکلم ہے، جو اللہ کے لیے آئی ہے اور مفعول 'کَ' کی ضمیر مخاطب ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے آئی ہے۔ یعنی 'توفی' کا فعل اللہ سے صادر ہو رہا ہے اور ایک انسان حضرت مسیح علیہ السلام پر منطبق ہو رہا ہے۔ اِس صورت میں اِس کے معنی قطعی طور پر روح قبض کرنے کے ہوں گے، جس کا لازمی نتیجہ موت ہے۔ چنانچہ عربی زبان و بیان کے لحاظ سے یہاں مسیح علیہ السلام کی وفات کے علاوہ کوئی اور مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا۔

خامساً، قرآن و حدیث کے نظائر بھی شاہد ہیں کہ 'توفی' جب اللہ اور انسان کی نسبت سے آتا ہے تو اِس کے معنی جان قبض کرنے کے ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی، جو زبان و بیان کے اِس قاعدے سے مختلف ہو۔ یہ نظائر آیندہ صفحات میں درج ہیں۔

'توفی' کی قبض روح کے معنی میں قرآن سے مثالیں

'توفی' کا فعل قرآنِ مجید میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ قبض روح کے معنی میں یہ درج ذیل صورتوں میں آیا ہے:

i۔ 'تَوَفِّیۡ' اللہ تعالیٰ کے فعل کے طور پر

ii۔ 'تَوَفِّیۡ' ملائکہ کے فعل کے طور پر

iii۔ 'تَوَفِّیۡ' موت کے فعل کے طور پر

iv۔ 'تَوَفِّیَ' مجہول (یُتَوَفّٰی) کی صورت میں

اِن صورتوں کے حوالے سے متعلقہ آیات کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ موت سے کیا مراد ہے؟ یعنی وہ عمل، وہ واقعہ یا وہ مرحلہ کیا ہے، جسے موت کہا جاتا ہے یا جس کے نتیجے میں موت واقع ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید نے اِس سوال کا جواب نہایت صراحت سے دیا ہے۔ سورۂ زمر میں ارشاد فرمایا ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا.... (42:39)	''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی جانیں قبض کرتا ہے، جب اُن کی موت کا وقت آجاتا ہے...۔''

اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی جانب سے 'توفی النفس'، یعنی جان قبض کر لینے کا واقعہ ہوتا ہے تو اُس وقت موت واقع ہوتی ہے۔ گویا موت کا نام 'توفی النفس' ہے اور 'توفی النفس' کا نام موت ہے۔ چنانچہ جب موت کہیں گے تو اُس کا مطلب یہ ہو گا کہ 'توفی النفس' ہوا ہے اور جب 'توفی النفس' کہیں گے تو اُس کا مطلب یہ ہو گا کہ موت واقع ہو گئی ہے۔[109]

اِس وضاحت کے بعد اب 'توفی' بہ معنی موت قرآنِ مجید کے شواہد کا ملاحظہ کر لیجیے:

i۔ 'تَوَفِّیَ' اللہ تعالیٰ کے فعل کے طور پر

قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں 'تَوَفّٰی' کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل کے طور پر آیا ہے۔ یعنی

---

[109] قرآن کی طے کردہ 'توفی النفس' کی یہ تعریف اگر ملحوظ رہے تو سورۂ آلِ عمران کے الفاظ 'اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ' سے 'توفی النفس' ہی کے معنی اخذ کرنے چاہییں۔ مزید برآں، یہ بھی واضح رہے کہ قرآن میں جب 'نَتَوَفَّیَنَّکَ'، 'یَتَوَفّٰکُمۡ'، 'تَوَفَّنَا'، 'تَوَفَّنِیۡ' کی صورت میں جو مختلف ضمیریں آئی ہیں، وہ مختلف نفوسِ انسانی ہی کے لیے آئی ہیں۔ یعنی مثال کے طور پر 'یَتَوَفّٰکُمۡ' کا مطلب 'یَتَوَفّٰی نفسَکُمۡ' یا 'یَتَوَفّٰی الاَنفُس' ہو گا۔

جملے کی تالیف اِس طرح ہے کہ اِس کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں اور مفعول انسان ہیں۔ اِس اسلوب میں یہ الفاظ یا مرکبات آئے ہیں:

- نَتَوَفَّيَنَّكَ، (اے پیغمبر)، ہم تم کو وفات دیں گے۔
- يَتَوَفّٰىكُمْ، وہ (اللہ) تم کو وفات دیتا ہے۔
- تَوَفَّنَا، (پروردگار)، تو ہم کو وفات عطا فرما۔[110]
- تَوَفَّنِيْ، (پروردگار)، تو مجھ کو وفات عطا فرما۔

اِن تمام اسالیب میں 'تَوَفِّیْ' کا فعل استعمال ہوا ہے۔ جملوں کی تالیف اِس طرح ہے کہ اِس کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں اور مفعول انسان ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ سورۂ یونس (10) کی آیت 46-47، سورۂ رعد (13) کی آیت 40 اور سورۂ مومن (40) کی آیت 77 میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ قریش اگر آپ کی رسالت کی تکذیب پر قائم رہیں گے تو پھر اُن پر دنیا ہی میں وہ عذاب آ کر رہے گا، جو اخروی عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور سنتِ الٰہی کے مطابق رسولوں کے منکرین پر لازماً آتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اِس لیے اٹل اور غیر متزلزل ہے۔ قرآن میں رسولوں کی تاریخ سے واضح ہے کہ اِس عذاب کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک صورت میں یہ رسول کی زندگی ہی میں برپا ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں فرعون اور اُس کے لشکر کو غرق کر دیا گیا۔ دوسری صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو وفات دینے کے بعد اِسے نازل فرماتے ہیں۔ اِس کی مثال یہود پر آنے والا عذاب ہے، جس کا سلسلہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے بعد شروع ہو گیا۔ مذکورہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش کے حوالے سے اِنھی دو صورتوں کا امکان ظاہر فرمایا ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ اللہ اِس عذاب کا کچھ حصہ آپ کی

---

[110] یہ اگرچہ انسان کی جانب سے اظہارِ امر کا جملہ ہے، مگر اِس میں بھی 'توفی' کے فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔

زندگی ہی میں ظاہر فرمادیں اور ممکن ہے کہ آپ کو وفات دینے کے بعد اِس کا فیصلہ فرمائیں۔

اِن تینوں مقامات پر 'نَتَوَفَّيَنَّكَ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی ہم آپ کو وفات دیں گے۔ 'توفیٰ' کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیا ہے اور اِس کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ. وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (یونس 10:46-47)

"ہم جس چیز کا وعدہ اُن سے کر رہے ہیں، اُس کا کوئی حصہ ہم تمھیں دکھائیں، (اے پیغمبر)، یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہر کیف اِن کو لوٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر اللہ اُس پر گواہ ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ (اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔"

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ. (الرعد 13:40)

"ہم جو وعید اِنھیں سنا رہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھائیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہر کیف تمھاری ذمہ داری صرف پہنچانا ہے اور اِن کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔"

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا

"(یہ نہیں مان رہے، اے پیغمبر)، تو

نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ. (المومن 40:77)

صبر کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ کا وعدہ بر حق ہے۔ پھر جس عذاب کی وعید ہم اِنھیں سنارہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھا دیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہر کیف اِن کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے۔"

استاذِ گرامی نے اِس امر کی وضاحت میں لکھا ہے:

"یہ اُس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے، جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔ اِس میں بالعموم یہی دو صورتیں پیش آتی ہیں۔ پہلی صورت کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں۔ دوسری صورت کی مثال یہود ہیں، جن کی پیٹھ پر عذاب کا تازیانہ مسیح علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد برسنا شروع ہوا۔" (البیان 4/ 382)

ب۔ سورۂ نحل (16) کی آیت 70 اور سورۂ یونس (10) کی آیت 104 میں 'يَتَوَفّٰكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم (انسانوں) کو موت دیتا ہے۔ سورۂ نحل میں اِس حقیقت کا بیان ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہی ہے، جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی اُن پر موت طاری کرے گا۔ یہ موت بچپن میں آنی ہے، جوانی میں آنی ہے یا بڑھاپے میں آنی ہے، اِس کا فیصلہ اللہ نے کرنا ہے۔ زندگی کی درازی یا اختصار اُسی کی مشیت پر منحصر ہے۔ سورۂ یونس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اِسی حقیقت کو آپ کے مخاطبین کے لیے نمایاں فرمایا ہے۔ یعنی جو اللہ تمھیں وفات دے گا، اُسی کے آگے تم جواب دہ ہو گے۔ آیات درجِ ذیل ہیں:

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَىْ لَا يَعْلَمَ

"اِسی طرح اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔ (تم

بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ.
(النحل16:70)

میں سے کچھ پہلے رخصت ہو جاتے ہیں) اور تم میں سے کچھ ارذل عمر کو پہنچا دیے جاتے ہیں، اِس لیے کہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانیں۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی جاننے والا ہے، وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (يونس10:104)

”(اے پیغمبر)، کہہ دو کہ لوگو، میرے دین کے بارے میں اگر (اب بھی) شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو، میں اُنھیں نہیں پوجتا، بلکہ اُس اللہ کو پوجتا ہوں جو تمھیں موت دیتا ہے (کہ جواب دہی کے لیے اُس کے سامنے حاضر ہو جاؤ)۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔“

ج۔ سورۂ آل عمران (3) اور سورۂ اعراف (7) میں یہی فعل ’تَوَفَّنَا‘ کے دعائیہ اسلوب میں آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: (پروردگار)، تو ہم کو وفات عطا فرما۔

آلِ عمران کی آیات 190 تا 194 میں اُن اصحاب بصیرت کا رویہ بیان ہوا ہے، جو اللہ کے رسول کی دعوت سامنے آنے کے بعد پوری سرگرمی اور دل جمعی کے ساتھ اُس پر لبیک کہتے ہیں۔ وہ بے عقلوں کی طرح نہ کٹ حجتی کرتے ہیں اور نہ کوئی نشانیاں طلب کرتے ہیں، بلکہ اپنے پروردگار سے دست بہ دعا ہوتے ہیں کہ وہ اُن کی مغفرت فرمائے اور اُن کی زندگی کا خاتمہ اپنے وفا شعار بندوں کے ساتھ کرے۔ قرآن نے اُن کی دعا اِن الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ‌ۚ
(آل عمران 3:193)

”پروردگار، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا کہ (لوگو)، اپنے پروردگار کو مانو تو ہم نے مان لیا۔ اب تو ہمارے گناہوں کو بخش دے، اے مالک۔ ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں اپنے وفادار بندوں کے ساتھ موت دے۔“

اعراف (7) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے جادوگروں کے مقابلے کی تفصیل درج ہے۔ اِس میں بیان ہوا ہے کہ جب جادوگروں پر حقیقت واضح ہوئی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تو فرعون نے للکارا کہ تم میری اجازت کے بغیر اُس کے ساتھ جا کھڑے ہوئے تو جان لو کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دوں گا اور تمھیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ اِس پر اُنھوں نے پورے عزم و ہمت سے جواب دیا کہ تم ہمارے ساتھ جو چاہے، کر لو، ہم اِس ایمان سے پیچھے نہیں ہٹیں گے، کیونکہ ہم نے اپنے رب کی نشانیاں دیکھ لی ہیں اور ہمیں اُسی کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔ اِس کے ساتھ اُنھوں نے اللہ سے یہ دعا کی کہ وہ اُنھیں اِس آزمایش میں صبر و استقامت عطا فرمائے اور اُنھیں اِس حال میں موت دے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں:

قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ‌ۚ وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا‌ ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ
(الاعراف 7:125-126)

”اُنھوں نے جواب دیا: (پھر کیا ہے)، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹیں گے! تم صرف اِس غصے میں ہمارے درپے آزار ہو رہے ہو کہ ہمارے پروردگار کی نشانیاں جب ہمارے پاس آ گئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے۔ پروردگار، (اب) تو ہم پر

صبر کا فیضان فرما اور ہمیں اِس حال
میں دنیا سے اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں۔"

د۔ سورۂ یوسف (12) کی آیت 101 میں 'تَوَفَّنِيْ'، یعنی "پروردگار، تو مجھے موت دے" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ الفاظ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا کے طور پر آئے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے، جب اُن کے والد اور بھائی اُن کے آگے جھک گئے اور اُن کے بچپن کے اُس خواب کی تعبیر سامنے آگئی، جس میں اُنھوں نے سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے آگے سجدہ ریز ہوتے دیکھا تھا۔ اِس موقع پر اُنھوں نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد یہ دعا کی کہ وہ اُنھیں اِس حال میں موت دے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں۔ اُن کے الفاظ یہ تھے:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ.

"پروردگار، تو نے مجھے اقتدار میں حصہ عطا فرمایا اور باتوں کی تعبیر کر لینے کے علم میں سے بھی سکھا دیا۔ زمین اور آسمانوں کے بنانے والے، دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر موت دے اور اپنے نیک بندوں کے زمرے میں شامل فرما۔"

ii۔ 'تَوَفّٰی' ملائکہ کے فعل کے طور پر

انسانوں کو موت دینا اللہ کا فعل ہے، مگر اللہ تعالیٰ عموماً یہ کام اپنے فرشتوں سے لیتے ہیں، اِس لیے قرآن مجید میں 'توفی' اللہ کے فرشتوں کے فعل کے طور پر بھی آیا ہے۔ اِن تمام موقعوں پر اِس کا معنی قبض روح، یعنی موت ہے۔

ا۔ سورۂ انعام (6) کی آیت 61 میں کارکنانِ قضا و قدر کے اِسی فعل کا ذکر ہوا ہے۔ اللہ

نے بتایا ہے کہ جب وہ کسی انسان کی موت کا فیصلہ کرتے ہیں تو اپنے فرستادوں کو اُس کی جان قبض کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ یہ کارکنان پوری ذمہ داری کے ساتھ اِس کام کو انجام دیتے ہیں۔ اِس میں وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ.

”وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور تم پر (اپنے) نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ہی اُس کی روح قبض کرتے ہیں اور (اِس کام میں) کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔“

ملائکہ کی یہی ذمہ داری ہے، جس کی بنا پر قرآنِ مجید نے جان قبض کرنے والے فرشتے کو ملک الموت، یعنی موت کے فرشتے کے نام سے موسوم کیا ہے۔ سورۂ سجدہ میں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ. (32:11)

”اِن سے کہو، تمھاری جان وہی موت کا فرشتہ قبض کرے گا، جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے“

ب۔ سورۂ نساء (4) کی آیت 97 میں دارالکفر میں رہنے والے اُن منافقوں اور بہانہ بازوں کا ذکر ہے، جنھیں کفر کی زندگی تو قبول ہے، مگر ہجرت قبول نہیں ہے۔ وہ اللہ کی نافرمانی گوارا کر رہے ہیں، مگر دین پر عمل کی خاطر اپنے مسکنوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فرشتے جب اُن کی جان قبض کریں گے تو اُن سے کہیں گے کہ اب تم اپنی بے بسی کا بہانہ تراش رہے ہو، کیا اللہ کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اپنے علاقے سے ہجرت کر کے دوسرے علاقے میں

چلے جاتے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ كُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِیۡهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا.

"(اِس موقع پر بھی جو لوگ اُن بستیوں سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جہاں اُنھیں دین کے لیے ستایا جارہا ہے، اُنھیں بتاؤ، اے پیغمبر کہ) جن لوگوں کی جان فرشتے اِس حال میں قبض کریں گے کہ (اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال کر) وہ اپنی جان پر ظلم کر رہے تھے، اُن سے وہ پوچھیں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم تو اِس ملک میں بالکل بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: کیا خدا کی زمین ایسی وسیع نہ تھی کہ تم اُس میں ہجرت کر جاتے۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"

ج۔ سورۂ انفال میں یہی بات کفار کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے:

وَلَوۡ تَرٰۤى اِذۡ یَتَوَفَّى الَّذِیۡنَ كَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓىِٕكَةُ یَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَ اَدۡبَارَهُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ.

(50:8)

"اگر تم دیکھ پاتے (تو دیکھتے کہ اُس وقت کیا گزر رہی تھی)، جب فرشتے اِن منکروں کی روحیں قبض کر رہے تھے، اِن کے چہروں اور اِن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو جلنے کا عذاب۔"

د۔ سورۂ محمد (47) کی آیت 27 میں قریش کے منافقین کو اُن کے انجام سے متنبہ کیا ہے۔ فرمایاہے کہ اگر اُن کا یہی منافقانہ طرزِ عمل جاری رہاتو پھر وہ دن دور نہیں، جب اللہ کے سخت گیر فرشتے اُن کے چہروں پر اور اُن کی پشتوں پر مارتے ہوئے اُن کی روحیں قبض کریں گے:

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ.

''(اِن کا یہی رویہ ہے) تو اُس وقت کیا ہو گا، جب فرشتے اِن کے مونہوں پر اور اِن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اِن کی روحیں قبض کریں گے ؟''

ایسی ہی عبرت ناک کیفیت اُن لوگوں کی ہو گی، جو شرک کی غلاظت میں مبتلا رہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے رہے۔ فرشتے جب اُن کی روحیں قبض کریں گے تو اُن پر مایوسی طاری ہو گی۔ اُن کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا کہ وہ اپنے کفر کی خود گواہی دیں۔ سورۂ اعراف میں آیاہے:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ.(37:7)

''سو اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اُس کی آیتوں کو جھٹلادیں۔ اُن کے نوشتے میں جو حصہ اُن کے لیے (دنیا کی زندگی میں لکھ دیا گیا) ہے، وہ اُنھیں پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے اُن کی روحیں قبض کرنے کے لیے اُن کے پاس آئیں گے تو پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے، وہ کہاں ہیں؟ وہ کہیں گے کہ وہ سب تو ہم سے کھوئے گئے اور اپنے خلاف خود

گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع منکر تھے۔"

ہ۔ سورۂ نحل (16) کی آیت 28 میں کفارِ قریش کے حوالے سے بھی یہی بات بیان ہوئی ہے کہ اُن کے پاس اللہ کے فرشتے پہنچیں گے تو وہ بھی جھوٹے عذر تراشیں گے اور بڑی لجاجت سے کہیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ فرشتے کہیں گے کہ جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ اُن کی جانیں قبض کر لیں گے:

الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۖ فَاَلۡقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعۡمَلُ مِنۡ سُوۡۤءٍ‌ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ.	"اُن پر، جن کی روح فرشتے اِس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہوں گے تو فوراً سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ (فرشتے جواب دیں گے): کیوں نہیں، بے شک اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔"

اِسی سلسلۂ کلام کی اگلی آیات سے واضح ہے کہ فرشتوں کی طرف سے روحوں کو قبض کرنے کا معاملہ صرف کفار، مشرکین، منافقین اور دوسرے مجرمین ہی کے ساتھ نہیں ہو گا، پاک باز اور متقی لوگوں کی روحیں بھی وہی قبض کریں گے۔ فرق یہ ہو گا کہ اُن کی روحیں قبض کرتے ہوئے وہ اُن کے لیے سلامتی کے کلمات کہیں گے اور اُنھیں جنت کی نوید سنائیں گے۔ ارشاد فرمایا ہے:

الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ‌ ۙ يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمُ‌ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ	"اُن کو، جن کی روح فرشتے اِس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (النحل16:32)

پاک ہیں۔ فرشتے کہیں گے: تم پر سلامتی ہو، جنت میں جا کر رہیے اپنے اعمال کے صلے میں۔"

iii۔ 'تَوَفِّیْ' موت کے فعل کے طور پر

'توفی' کا فعل اِس طرح بھی استعمال ہو جاتا ہے کہ موت اُس کا فاعل بن رہی ہو۔ یہ صرف عربی ہی کا نہیں، ہر زبان کا معروف اسلوب ہے کہ جملے میں کوئی فعل یا کوئی کیفیت یا کوئی واقعہ فاعل کے طور پر آ جاتا ہے۔ جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں:

اُس پر تباہی آ گئی۔

اُسے مصیبتوں نے گھیر لیا۔

اُس پر خوف طاری ہو گیا۔

اُس پر نیند غالب آ گئی۔

اُسے بیماری لاحق ہو گئی۔

اُس کو غربت نے مار دیا۔

اُسے موت نے آ لیا۔

سورۂ نساء (4) کی آیت 15 میں 'حَتّٰی يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس کا مطلب ہے: "یہاں تک کہ اُن کی موت آ جائے۔" یہ الفاظ زنا کی عادی قحبہ عورتوں کے لیے آئے ہیں۔ فرمایا ہے کہ اِن عورتوں کو اِن کے گھروں میں قید کر دو، یہاں تک کہ وہ موت کا شکار ہو جائیں یا اللہ اُن کے بارے میں کوئی قانون نازل فرما دیں۔[111] ارشاد ہے:

---

[111] بعد ازاں زنا کی سزا کا قانون نازل ہو گیا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ قانون سورۂ نور (24) کی

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا.

”اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں، اُن پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو اُنھیں گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ اُن کی موت آجائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔“

iv۔ 'تَوَفّٰی' فعل مجہول (یُتَوَفّٰی) کی صورت میں

قرآنِ مجید میں 'توفی' مضارع مجہول کی صورت میں بھی آیا ہے۔[112] اِس ضمن میں سورۂ حج (22) اور سورۂ مومن (40) میں 'یُتَوَفّٰی' اور سورۂ بقرہ (2) میں 'یُتَوَفَّوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے معنی بالترتیب یہ ہیں: ”اُسے وفات دی جاتی ہے۔ اُنھیں وفات دی جاتی ہے۔“ عربی زبان کے عرف کے مطابق اِس صورت میں بھی فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے، جو جملے کے مجہول اسلوب کی وجہ سے مذکور نہیں ہوتا۔ اِس اسلوب میں بھی یہ لفظ موت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے مقامات درج ذیل ہیں۔

ا۔ حج (22) کی آیت 5 اور مومن (40) کی آیت 67 میں دنیا میں انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو پیدا کرنے کے بعد اُن کی پرورش کرتا ہے۔ اِن میں سے بعض کو وہ بچپن ہی میں اپنے پاس بلا لیتا ہے، بعض جوانی میں اُس کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے میں وفات پاتے ہیں۔ اِن سب کی زندگی محدود

ابتدائی آیات میں مذکور ہے۔

112 فعل مجہول کے ساتھ فاعل مذکور نہیں ہوتا، مفعول ہی اِس کا قائم مقام ہوتا ہے۔

ہے اور اُن کی موت کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ اُس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ اور جس طرح یہ موت آتی ہے، اُسی طرح قیامت بھی آ کر رہے گی۔ اُسے بھی کوئی نہیں روک سکے گا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَـكُمۡ ؕ وَ نُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ۚ وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّتَوَفّٰى وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡــًٔا ؕ وَ تَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ وَ اَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ. (الحج 5:22)

”لوگو، اگر تمھیں دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کچھ شک ہے تو غور کرو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو پوری بھی ہوتی ہے اور ادھوری بھی۔ اِس لیے کہ تم پر کچھ حقائق واضح کریں (جو تم کو سمجھنے چاہییں)۔ ہم جو چاہتے ہیں، ایک مقرر مدت تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں۔ پھر ایک بچے کی صورت میں تمھیں نکال لاتے ہیں۔ پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی (بڑھاپے کی) نکمی عمر کو پہنچایا جاتا ہے کہ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ بھی نہیں جانتا۔ اِسی طرح زمین کو دیکھتے ہو کہ خشک پڑی ہے۔ پھر جب ہم اُس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر طرح کی خوش منظر

چیزیں اگاتی ہے۔"

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ.(المومن 67:40)

"وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر تم کو وہ بچے کی صورت میں ماں کے پیٹ سے نکالتا ہے، پھر تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو، پھر تم کو مہلت دیتا ہے کہ بڑھاپے کو پہنچ جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی اِس سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور کسی کو وہ مہلت دیتا ہے کہ تم ایک مقرر مدت پوری کر لو اور یہ سب اِس لیے کہ تم (حقائق کو) سمجھو۔"

ب۔ سورۂ بقرہ (2) میں جہاں بیوہ عورتوں کی عدت کا قانون بیان ہوا ہے، وہاں اُن کے مرنے والے شوہروں کے لیے 'يُتَوَفَّوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی وہ مرد جو وفات پا جائیں۔ آیت 234 کے الفاظ ہیں:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ.

"اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔"

آیت 240 میں ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

”اور ہاں، (بیوہ اور مطلقہ کے بارے میں جو ہدایات تمھیں دی گئی ہیں، اُن سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ) تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی اُن بیویوں کے لیے سال بھر کے نان و نفقہ کی وصیت کر جائیں اور یہ بھی کہ (اِس عرصے میں) اُنھیں گھر سے نہ نکالا جائے۔ لیکن وہ خود گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ دستور کی بات وہ اپنے معاملے میں کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔“

’توفی‘ کی قبض روح کے معنی میں حدیث سے مثالیں

’توفی‘ کا لفظ احادیث میں بھی جا بہ جا موت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بہ طورِ مثال چند روایتیں درج ذیل ہیں۔

اِس سلسلے میں سب سے پہلے وہ روایت دیکھیے، جس میں ’توفی‘ کا یہی فعل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے لیے استعمال ہوا ہے۔[113] ابو داؤد میں نقل ہوا ہے:

---

[113] یہاں اُن سب شارحین نے اِس لفظ کے معنی موت کے کیے ہیں، جنھوں نے آلِ عمران کی زیرِ بحث

عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس بيني وبينه يعني عيسى عليه السلام نبي، وإنه نازل، فإذا رأيتموه فاعرفوه، رجل مربوع إلى الحمرة والبياض، بين ممصرتين، كأن رأسه يقطر وإن لم يصبه بلل، فيقاتل الناس على الإسلام فيدق الصليب، ويقتل الخنزير، ويضع الجزية، ويهلك الله في زمانه الملل كلها إلا الإسلام ويهلك المسيح الدجال، فيمكث في الارض أربعين سنة ثم يتوفى، فيصلي عليه المسلمون. (رقم 4324)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اور اُن (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور وہ نازل ہونے والے ہیں۔ جب تم اُنھیں دیکھو تو اُنھیں پہچان لینا۔ وہ درمیانے قد کے شخص ہوں گے، اُن کے چہرے کا رنگ سرخ و سفید ہو گا۔ وہ دو زرد رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ اُن کے سر کے بال ایسے ہوں گے، جیسے اُن سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالاں کہ وہ بھیگے ہوئے نہیں ہوں گے۔ وہ اسلام کی خاطر لوگوں سے جنگ کریں گے۔ صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے۔ اُن کے زمانے میں اللہ اسلام کے سوا تمام ملتوں کو ہلاک کر دے گا۔ وہ المسیح الدجال کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ زمین میں چالیس سال رہیں گے۔ پھر وہ وفات پا جائیں گے اور مسلمان اُن کی

آیت میں اِسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ وصول کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

نماز جنازہ پڑھیں گے۔“

بخاری کی روایت کے مطابق حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے لیے ’وتوفاہ اللّٰہ علی رأس ستین سنۃً‘ (اللہ نے آپ کو ساٹھ سال کی عمر میں وفات دی) کے الفاظ استعمال کیے ہیں:

عن انس بن مالك رضى الله عنه... بعثه الله على راس اربعين سنة، فاقام بمكة عشر سنين وبالمدينة عشر سنين، وتوفاه الله على رأس ستين سنة. (رقم 5900)	”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے... اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس سال کی عمر میں رسول بنایا۔ دس سال آپ نے (نبوت کے بعد) مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور دس سال مدینۂ منورہ میں اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔“

بخاری کی ایک روایت میں وہ واقعہ نقل ہوا ہے، جب حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے کا مسئلہ لے کر آئے۔ اِس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے یہی ’توفی‘ کا فعل استعمال کیا۔ روایت کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:

قال لعلى وعباس: انشدكما بالله، هل تعلمان ذلك؟ قالا: نعم، ثم توفى الله نبيه صلى الله عليه وسلم، فقال ابو بكر: انا ولى رسول الله، فقبضها ابو بكر يعمل فيها بما عمل به فيها رسول الله صلى الله	”پھر اُنھوں نے (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے) علی اور عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تمھیں یہ بھی معلوم ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ جی ہاں، معلوم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو

علیه وسلم وانتما حینئذ. واقبل علی علی وعباس، تزعمان ان ابا بکر کذا وکذا واللہ یعلم انه فیها صادق بار راشد تابع للحق، ثم توفی اللہ ابا بکر. (رقم 5358)

وفات دی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ چنانچہ اُنھوں نے اُس جایداد کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق اُس میں عمل کیا اور آپ دونوں اُس وقت موجود تھے ۔ پھر علی اور عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر اُنھوں نے کہا: آپ خوب جانتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا تھا اور اللہ جانتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اِس میں مخلص، محتاط و نیک نیت اور صحیح راستے پر تھے اور حق کی اتباع کرنے والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی وفات دی۔“

ابنِ ماجہ کی ایک روایت میں حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے لیے ’توفی اللہ‘ کے الفاظ آئے ہیں:

عن ابی لبابة بن عبد المنذر قال: قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: إن یوم الجمعة سید الایام واعظمها عند اللہ... خلق اللہ فیه آدم واهبط اللہ فیه آدم إلی الارض وفیه توفی اللہ آدم.... (رقم 1084)

”ابولبابہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک، جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت والا دن ہے، ... اللہ تعالیٰ نے اِسی دن آدم کو پیدا

فرمایا، اِسی دن اُن کو روے زمین پہ
اتارا، اِسی دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو
وفات دی...۔"

بیہقی، السنن الکبریٰ کی ایک روایت میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ اتنا طویل کیا کہ اُنھیں گمان ہوا کہ اللہ نے آپ کو وفات دے دی ہے۔ اِس روایت میں 'توفیٰ' کا لفظ وفات کے معنی میں دو مرتبہ آیا ہے۔ روایت یہ ہے:

عن عبد الرحمن بن عوف قال: ... فاستقبل القبلة فسجد فأطال السجود وأنا وراءه حتى ظننت أن الله تعالىٰ توفاه فأقبلت أمشى حتى جئته فطأطأت رأسى أنظر فى وجهه فرفع رأسه، فقال: ما لك يا عبد الرحمن؟ فقلت: لما أطلت السجود يا رسول الله، خشيت أن يكون الله قد توفى نفسك.
(رقم 3936)

"حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہوئے اور سجدے میں چلے گئے۔ میں آپ کی اقتدا میں تھا۔ آپ نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ مجھے گمان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی ہے۔ میں آپ کے قریب ہو گیا اور اپنا سر نیچے جھکا کر آپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اِس پر آپ نے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا: عبد الرحمٰن کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، جب آپ نے سجدے کو لمبا کیا تو مجھے ڈر ہوا کہ اللہ نے آپ کو وفات دے دی ہے۔"

’توفی‘ کا نیند کے لیے استعمال

آیات اور احادیث کے مذکورہ بالا نظائر سے یہ بات پوری طرح متحقق ہو گئی ہے کہ اگر ’توفی‘ کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان ہو تو اُس کے معنی قبض روح، یعنی موت ہی کے ہوتے ہیں۔ اِس صورت میں اِس فعل کے کوئی اور معنی نہیں ہو سکتے۔ اِس استدلال پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآنِ مجید کے دو مقامات ایسے ہیں، جہاں ’توفی‘ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور مفعول انسان ہے، مگر اِس کے باوجود یہ فعل موت کے معنی میں نہیں آیا۔ اِس کے بجاے یہ نیند کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جو زندگی ہی کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ مقامات درجِ ذیل ہیں:

وَهُوَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰىكُمۡ بِالَّیۡلِ وَیَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ.... (الانعام 6:60)	”وہی ہے جو رات میں تمھاری روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ دن میں کرتے ہو، اُسے بھی جانتا ہے...۔“
اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِهَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِهَا.... (الزمر 39:42)	”حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی جانیں قبض کرتا ہے، جب اُن کی موت کا وقت آجاتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی ہوتی، اُنھیں بھی نیند کی حالت میں اِسی طرح قبض کر لیتا ہے...۔“

ہمارے نزدیک یہ خیال درست نہیں ہے کہ یہاں یہ لفظ نیند کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہر گز نہیں۔ یہاں بھی یہ لفظ بعینہٖ قبض روح کے اُسی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس میں سورۂ آلِ عمران اور مذکورالصدر دیگر مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

دیکھیے، ہم نے بیان کیا ہے کہ ’توفی‘ کا فعل جب اِس طرح آئے کہ اُس کا فاعل اللہ اور مفعول انسان ہو تو اُس کا معنی قبض روح ہے۔ موت یا نیند قبض روح کے دو مختلف نتائج ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اِس اسلوب میں 'توفی' کا براہِ راست معنی موت نہیں ہے، بلکہ نتیجتاً ہے۔ اِس کا اصل معنی روح قبض کرنا ہی ہے۔

سورۂ انعام اور سورۂ زمر کی درجِ بالا آیات سے واضح ہے کہ موت اور نیند، دونوں صورتوں میں روح قبض ہو کر اللہ تعالیٰ کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔[114] فرق یہ ہے کہ نیند کے موقع پر اُسے واپس کر دیا جاتا ہے اور انسان بیدار ہو جاتا ہے، جب کہ موت کے موقع پر اُسے واپس نہیں کیا جاتا اور انسان تا قیامت بیدار نہیں ہوتا۔[115] بیداری اور عدم بیداری کا یہ فرق ہمارے مشاہدے کے لحاظ سے ہے۔ اِس کی حقیقت امورِ متشابہات میں سے ہے، لہٰذا ہمارے فہم و ادراک سے ماورا ہے۔

اِس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ 'توفی' جب اللہ تعالیٰ کے فعل کے طور پر آئے تو اُس کے ایک ہی معنی جان قبض کرنا ہوں گے۔ تاہم، نتیجے کے لحاظ سے اِس کا انطباق دو مختلف صورتوں پر ہو گا۔ ایک موت پر اور دوسرے نیند پر۔ گویا 'توفی' بہ معنی قبض جان کو دونوں مظاہر میں قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ اِسی اشتراک کی وجہ سے بعض اوقات موت کے لیے 'نیند' کا اور نیند کے لیے 'موت' کا لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ یہ محض تصور یا ظہور کا اشتراک نہیں ہے، حقیقتِ واقعہ کا اشتراک بھی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی صبح کی دعا میں نیند کے لیے موت کے الفاظ اِسی بنا پر آئے ہیں:

الحمد للہ الذی أحیانا بعد ما   "شکر اللہ ہی کے لیے ہے، جس نے ہم

---

114 نیند کے موقع پر قبض جان کی کیا نوعیت ہوتی ہے، اُسے ہم جان نہیں سکتے، اُسے اللہ ہی جانتا ہے۔ ہمیں بس اتنا بتایا گیا ہے کہ اُس موقع پر اُسی طرح جان قبض ہوتی ہے، جیسا کہ موت کے موقع پر ہوتی ہے۔

115 نیند کے وقت قبض کی گئی جان کچھ دیر بعد واپس کر دی جاتی ہے، مگر موت کے وقت قبض کی گئی جان محشر کے روز واپس کی جائے گی۔

أماتنا وإليه النشور.	کو موت کے بعد پھر زندگی عطا فرمائی اور
(بخاری، رقم 6312)	ایک دن لوٹنا بھی اُسی کی طرف ہے۔"

چنانچہ 'توفی' جب نیند کے لیے آئے تو اُسے موت کا مجازی استعمال تصور کرنا درست نہیں ہے۔ یہ اِس لفظ کا حقیقی استعمال ہے، جس کا معنی قبض روح ہے۔

اِس بات کو سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی درجِ ذیل آیتوں میں لفظ 'اَحۡيَآءٌ' کے استعمال سے سمجھا جا سکتا ہے:

وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ. (البقرہ 2:154)	"اور جو لوگ اللہ کی (اِس) راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم (اُس زندگی کی حقیقت) نہیں سمجھتے۔"
وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ. (آل عمران 3:169)	"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، اُنھیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، اُنھیں روزی مل رہی ہے۔"

اِن آیات میں اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کے لیے 'اَحۡيَآءٌ' کا لفظ آیا ہے، یعنی وہ زندہ ہیں۔ یہاں لفظ 'اَحۡيَآء' کا وہی معروف مطلب ہے، جس کے لیے ہم 'زندگی' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اِس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہو گا کہ 'اَحۡيَآء' کا ایک مطلب زندگی اور دوسرا مطلب عدم زندگی ہے۔ عام زندگی اور شہید کی زندگی میں فرق زندہ ہونے یا نہ ہونے کا نہیں، بلکہ ہمارے فہم و مشاہدہ کے لحاظ سے نوعیت اور کیفیت کا ہے۔[116]

---

[116] مثال کے طور پر "جان دار" کے الفاظ خواہ جانوروں کے لیے استعمال ہوں یا پودوں کے لیے، اِن کا

ایک کی حقیقت کو ہم کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں اور دوسری کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔[117]

زبان و بیان کے اسالیب کا یہ معروف طریقہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے مستعمل معنی پر قائم رہتے ہوئے اضافی مطالب کی تفہیم کا فائدہ دیتے ہیں۔ اِس صورت میں اُن کا ظاہری مفہوم تو وہی معروف مفہوم ہوتا ہے، البتہ مرادی مفہوم مجازی ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے دو شعر بہ طورِ مثال ملاحظہ کر لیجیے:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکش انقلاب

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسم فغاں تک ہے

پہلے شعر میں اقبال نے انقلاب کے بغیر زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے، جب کہ دوسرے شعر میں خاموشی کو موت قرار دیا ہے۔ اِس بنا پر یہ اخذ کرنا درست نہ ہو گا کہ موت کا ایک معنی خاموشی ہے اور ایک اور معنی ایسی زندگی ہے، جو انقلاب سے خالی ہے۔ ہر ادب شناس جانتا ہے کہ یہاں موت اپنے مستعمل مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے، مگر شاعر نے سکوت کے قرار اور عدم تغیر کے جمود کو نمایاں کرنے کے لیے اُسے موت سے تشبیہ دی ہے۔

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ جب 'توفی' کا فاعل اللہ اور مفعول انسان ہو تو اُس سے جان کا قبض کرنا مراد ہوتا اور اُس کا اطلاق دو مختلف صورتوں —— موت اور نیند —— پر ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نیند اور موت تو دو الگ الگ حالتیں ہیں۔ ایک حالت واقع ہو تو

معنی و مفہوم بالکل یکساں ہوتا ہے۔ دونوں جان داروں میں جو فرق تجربے اور مشاہدے کی بنا پر کیا جاتا ہے، اُس کا تعلق نوعیت اور کیفیت سے ہے۔ لفظ کے مستعمل مفہوم سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[117] 'وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ'، "لیکن تم (اُس زندگی کی حقیقت) نہیں سمجھتے۔" کے الفاظ سے اِسی چیز کو واضح فرمایا ہے۔

زندگی برقرار رہتی ہے اور دوسری واقع ہو تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اِس تناظر میں 'توفی اللہ نفسہ' (اللہ نے اُس کی جان کو قبض کر لیا) کے جملے سے یہ کیسے طے ہو گا کہ یہاں موت اور نیند میں سے کون سی حالت مراد ہے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ اِس کا فیصلہ جملے یا کلام کے قرائن سے ہو گا۔ کسی جملے میں لفظ حقیقی معنی میں آیا ہے یا مجاز کے لیے آیا ہے یا اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، اِس کا تعین جملے کے شواہد کرتے ہیں۔ اِسی طرح لفظ کے مختلف معانی میں سے متکلم نے کون سے معنی اختیار کیے ہیں، اِس کا تعین بھی کلام کے قرائن سے ہوتا ہے۔ یہ قرائن و شواہد جملے یا اُس کے سیاق و سباق میں موجود ہوتے ہیں اور پوری صراحت کے ساتھ حتمی معنی کو متعین کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قاری کو متکلم کا منشا جاننے میں کبھی دشواری پیش نہیں آتی۔

سورۂ زمر اور سورۂ انعام کی درج بالا آیات میں وہ قرائن، جنھوں نے 'توفی' کے فعل کو نیند کے ساتھ خاص کر دیا ہے، 'فِيْ مَنَامِهَا' اور 'بِالَّيْلِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن کے علاوہ سیاق و سباق اور جملے کا اسلوب بھی اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں نیند کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں لیا جا سکتا۔

2۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' — مولانا اصلاحی کی تفسیر

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے استاذ امام امین احسن اصلاحی نے سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ آیت میں 'توفی' کے لفظ کو قبض روح یا موت کے معنی پر محمول نہیں کیا۔ اُنھوں نے اِسے 'اخذ بالتمام' کے مفہوم میں لیا ہے۔ چنانچہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک اِس معاملے میں جمہور علما کا موقف ہی درست ہے، جس کی رو سے مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف زندہ اٹھا لیا تھا۔ اپنے موقف کے اثبات کے لیے اُنھوں نے 'توفی' کے معنی کے علاوہ بعض دیگر دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ اِن دلائل کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

1۔ 'تَوَفِّیْ' کے حقیقی معنی 'الاخذ بالتمام'، یعنی کسی شے کے پورا پورا لے لینے کے ہیں۔

2۔ موت کے لیے یہ لفظ بہ طورِ مجاز استعمال ہوتا ہے۔

3۔ اِس بات کا تعین کلام کے قرائن سے ہو گا کہ یہاں یہ لفظ اپنے حقیقی معنی (پورا پورا لے لینے) میں آیا ہے یا مجازی مفہوم (موت) کے لیے استعمال ہوا ہے۔

4۔ درجِ ذیل قرائن مانع ہیں کہ یہاں 'تَوَفِّیْ' کے مجازی مفہوم کو قبول کیا جائے:

i۔ آیت اور اُس کا سیاق و سباق اللہ کی طرف سے بشارت اور وعدۂ نصرت کو نمایاں کر رہا ہے۔ موت کے معنی لینے کی صورت میں یہ واقعہ بشارت اور نصرت کا مظہر نہیں

بنتا۔ اِس کے بجائے یہود کی خواہش کا مظہر بن جاتا ہے۔ یعنی اُن کی حضرت مسیح کو موت دینے کی چال بعینہٖ کامیاب قرار پاتی ہے۔ جب کہ کلام بتارہا ہے کہ اللہ نے اُن کی چال کو ناکام کر دیا تھا۔ چنانچہ اسلوب کلام زندہ اٹھالینے کی تائید تو کرتا ہے، مگر موت کے مفہوم کی تائید نہیں کرتا۔

ii۔ 'توفی' کا معنی موت کرنے کی صورت میں 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے الفاظ کی معنویت قائم نہیں رہتی۔ چنانچہ اگر یہاں موت کا مفہوم مراد ہوتا تو بات 'مُتَوَفِّيْكَ' ہی پر مکمل ہو جاتی، 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے اضافے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اب اگر 'توفی' کو موت کے بجائے پورا لینے پر محمول کیا جائے تو 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے الفاظ بالکل حسبِ حال ہو جاتے ہیں۔

iii۔ اِس میں شبہ نہیں کہ رفع کا فعل بلندیِ درجات کے لیے بھی آتا ہے، مگر قرآن کے نظائر سے واضح ہے کہ یہ جب بھی اِس مفہوم میں آتا ہے تو 'الیٰ' کے صلے کے بغیر آتا ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کی صورت میں آیا ہے۔ لہٰذا اِس کا معنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ''میں تیرے درجات بلند کرنے والا ہوں''۔ اِس صورت میں 'اِلَیَّ' کا لفظ بالکل اضافی قرار پائے گا۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ 'توفی' کو موت کے معنی میں لے کر 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' سے علوِ مراتب مراد لیا جائے۔

iv۔ قرآنِ مجید میں یہی بات جب سورۂ نساء میں بیان ہوئی ہے تو وہاں 'مُتَوَفِّيْكَ' کے الفاظ ارشاد نہیں فرمائے۔ وہاں 'رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اللہ نے اُس کو اپنی جانب اٹھالیا۔ اِس طرح قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ اُس نے سورۂ آل عمران میں 'توفی' کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مزید برآں، اللہ نے حضرت مسیح کے قتل اور صلیب دیے جانے کی نفی کی ہے۔ یہ بالواسطہ آپ کی موت کی نفی ہے۔ اِس تردید کے بعد آپ کی موت کا موقف اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

یہ امام امین احسن اصلاحی کے موقف کا خلاصہ ہے۔ تفصیل درجِ ذیل ہے:

''تَوَفِّیْ' کے اصل معنی عربی لغت میں، 'الاخذ بالتمام' کسی شے کے پورا پورا لے لینے یا کسی چیز کو اپنی طرف قبض کر لینے کے ہیں۔ موت دینے کے معنی میں اِس لفظ کا استعمال حقیقتاً نہیں، بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ ایسے الفاظ جو اپنے حقیقی اور مجازی، دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اپنے صحیح مفہوم کے تعین میں قرائن کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہاں مندرجہ ذیل قرائن اِس بات کے خلاف ہیں کہ اِس کے معنی یہاں موت دینے کے لیے جائیں۔

ایک یہ کہ یہ موقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا مسیح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کے لیے بشارت اور وعدۂ نصرت کا ہے۔ جملہ رسولوں کی سرگذشتیں اِس امر کی شاہد ہیں کہ جب اُن کی قوموں نے اُن کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی حفاظت و نصرت کی بشارت دی ہے۔ یہاں بھی آیت پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ پوری آیت بشارت اور وعدۂ نصرت ہی کی ہے۔ اِس سیاق و سباق میں آخر یہ کہنے کا کیا محل ہے کہ میں تمھیں موت دینے والا ہوں، یہ تو وہی چیز ہوتی، جس کے خواہاں یہود تھے۔ فرق صرف ذریعے کا ہوتا کہ موت یہود کے ہاتھوں نہیں، بلکہ قدرت کے ہاتھوں واقع ہوتی۔

دوسرا یہ کہ اگر اِس لفظ سے یہاں موت دینا مراد ہے تو اِس کے بعد 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے الفاظ بالکل غیر ضروری ہو کے رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ میں تمھیں موت دینے والا اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں؟ موقع دلیل ہے کہ یہاں 'مُتَوَفِّیْكَ' کے بعد 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے الفاظ 'تَوَفِّیْ' کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں کہ تمھاری 'تَوَفِّیْ' کی شکل یہ ہو گی کہ میں تمھیں اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

تیسرا یہ کہ 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے معنی مجرد رفع درجات لینا صحیح نہیں ہے۔ اِس صورت میں 'اِلَیَّ' کا لفظ بالکل بے ضرورت ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے 'رَافِعُكَ' کافی تھا۔ 'اِلَیَّ' کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن میں دیکھ لیجیے، جہاں بھی یہ لفظ

بلندیِ مرتبہ کے مضمون کے لیے استعمال ہوا ہے، بغیر 'الیٰ' کے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ. (بقرہ۔ 253) "اور اِن میں وہ بھی ہیں، جن سے اللہ نے بات کی اور بعض کے مدارج بلند کیے۔"

وَلَوۡشِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَى الۡاَرۡضِ. (اعراف۔ 176) "اور اگر ہم چاہتے تو اِن آیات کے ذریعے سے اُن کا رتبہ بلند کرتے، لیکن وہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔"

وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا. (مریم۔ 57) "اور ہم نے اُس کو فائز کیا اونچے درجے پر۔"

اگر حرف 'اِلیٰ' کا صحیح صحیح حق ادا کیا جائے، اور یہ حق ادا کرنا ضروری ہے تو 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تم کو عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں۔

چوتھا یہ کہ قرآن نے دوسرے مقام میں جہاں یہ مضمون بیان کیا ہے، وہاں 'مُتَوَفِّيكَ' کا لفظ بالکل اڑا دیا ہے، قتل اور سولی کی نفی کے بعد جس چیز کا اثبات کیا ہے، وہ صرف اٹھا لیے جانے کا ہے۔ 'بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ' (بلکہ اللہ نے اُس کو اپنی جانب اٹھا لیا) یہ اِس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ قرآن نے یہ 'تَوَفِّيْ' کی اصل شکل بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی جانب اٹھا لیا۔ آیت ملاحظہ ہو:

> وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا.(157-158)
>
> "اور نہ اُنھوں نے اُس کو قتل کیا اور نہ اُس کو سولی دی، بلکہ معاملہ اُن کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اِس بارے میں اختلاف کیا، وہ اُس کی طرف سے شک میں ہیں، اُنھیں اِس کے بارے میں کوئی علم نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں اور اُنھوں نے اِس کو قتل یقیناً نہیں کیا، بلکہ اُس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

یہ آیت سب سے زیادہ موزوں مقام اپنے اندر رکھتی تھی، اِس بات کے بیان کے

لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کس طرح ہوئی؟ اِس لیے کہ یہاں قرآن نے بڑی تاکید اور شدت کے ساتھ اُن لوگوں کی تردید کی ہے، جو اُن کے قتل یا اُن کی سولی کے مدعی تھے۔ اگر آپ کی موت واقع ہوئی ہوتی تو اِس موقع پر قرآن صاف صاف یوں کہتا کہ نہ اُن کو قتل کیا گیا اور نہ اُن کو سولی دی گئی، بلکہ اللہ نے اُن کو وفات دی۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ کہا نہیں، بلکہ یہاں 'تَوَفِّيْ' کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ صرف 'رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' کا لفظ استعمال کیا۔ ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ قتل اور سولی کی نفی کے بعد اِس رفع سے موت مراد لینے کی کس حد تک گنجایش ہے۔

'وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' یعنی اِس گندے معاشرے سے الگ کر کے تمھیں صالحین و ابرار کے زمرے میں داخل کروں گا۔ انبیا علیہم السلام کے لیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ جس قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے جاتے ہیں، اُس کے اندر اُس وقت تک وہ قیام کرتے ہیں، جب تک اُن کے ایمان لانے کی کچھ توقع ہوتی ہے۔ یہ توقع اُس وقت ختم ہو جاتی ہے، جب قوم کے لوگ نبی کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت نبی بحکم الٰہی ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر جس طرح روح کی علیحدگی کے بعد جسم کے لیے سڑنے اور گلنے کے سوا کوئی اور شکل باقی نہیں رہ جاتی، اُسی طرح نبی کی علیحدگی کے بعد اُس کے جھٹلانے والوں کے لیے ہزیمت اور ذلت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ نبی اور اُس کے ساتھی گندے ماحول سے نکل کر پاکیزہ اور صحت بخش ماحول میں داخل ہو جاتے ہیں، جس سے اُن کی روحانی قوت و صحت میں اضافہ ہوتا ہے۔ برعکس اِس کے نبی کے دشمن زندگی بخش عناصر سے یک قلم محروم ہو کر پوری تیزی کے ساتھ ہلاکت کی وادی کی طرف چل پڑتے ہیں۔... سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ رفع آسمانی بھی چونکہ ایک نوعیت کی ہجرت ہی ہے، اِس وجہ سے جس طرح تمام رسولوں کو ہجرت کے بعد فتح و کامیابی کی بشارت ملی، اِسی طرح آپ کو بھی اِس ہجرت کے ساتھ کامیابی و فتح مندی کی، جیسا کہ آگے بیان ہے، بشارت ملی۔" (تدبر قرآن 2/ 103-105)

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک بہ صد احترام امام امین احسن اصلاحی کا یہ موقف درست نہیں ہے۔ امام کے دلائل پر استاذ کا نقد درجِ ذیل نکات پر مبنی ہے:

1۔ 'توفی' کو یہاں 'الاخذ بالتمام' کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ یہ جب اللہ یا اُس کے فرشتوں کے فعل کے طور پر آئے اور اِس کا مفعول انسان ہو تو عربیت کی رو سے اِس کے معنی جان قبض کرنے کے ہوں گے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اِس کے نظائر موجود ہیں۔ اِن میں سے کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے، جہاں اِسے اخذ بالتمام کے معنی میں لیا گیا ہو۔ احادیث اور اعلیٰ عربی ادب سے بھی اِس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ یہ فعل جب اِس طریقے سے آئے تو اِسے لازماً قبض روح کے معنی پر محمول کرنا چاہیے۔ اِس کے بجائے کسی اور معنی میں لینا قرآنِ مجید اور عربی زبان کے عرف کے خلاف ہے۔

2۔ جب 'توفی' کے معنی قطعی طور پر قبض روح کے ہیں تو اِس آیت کے باقی اجزا، یعنی 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' اور 'وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے مدعا و مفہوم کو اِنھی کی روشنی میں طے کیا جائے گا۔ اِسی طرح سورۂ نساء (4) کی آیت 158 کے الفاظ کی تاویل بھی اِنھی کی روشنی میں کی جائے گی۔

3۔ یہ درست ہے کہ آیت کا سیاق و سباق اللہ کی طرف سے بشارت اور نصرت کو نمایاں کر رہا ہے۔ یہاں اِس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ اللہ نے اپنی خفیہ تدبیر سے یہود کی خفیہ تدبیروں کو ناکام کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے۔

چنانچہ اولاً، اللہ نے یہود کی دست برد سے حضرت مسیح کی حفاظت فرمانے کا اعلان کیا، لہٰذا وہ پوری کوشش کے باوجود نہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ صلیب دے سکے۔ اللہ نے خود آپ کی روح قبض فرمائی۔

ثانیاً، اللہ نے آپ کے جسم کو بھی ہر طرح کی بے حرمتی سے محفوظ رکھنے کا اعلان کیا اور اِس مقصد کے لیے اُسے اپنی جانب اٹھا لیا، وہ آپ کے وجود کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔

ثالثاً، یہ تسلی فرمائی کہ وہ آپ کو اِن دشمنوں سے محفوظ کر کے صالحین و ابرار کی دنیا میں

لے جائے گا۔ گویا وہی معاملہ کرے گا، جو اپنے رسولوں سے مرحلۂ اتمام حجت کے بعد کرتا ہے۔ یعنی رسولوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ منکروں کو چھوڑ کر چلے جائیں تاکہ اللہ اُن پر اپنا عذاب نازل کر دے۔

جہاں تک بشارت کا معاملہ ہے تو اُس کے بارے میں واضح فرمایا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیروی کرنے والے مسیح کا انکار کرنے والوں پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ آخر الامر منکرین کے لیے تاقیامت محکومی کے عذاب کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ امام امین احسن اصلاحی کے موقف اور اُس کے تقابل میں جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا خلاصہ ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ امام کے موقف کی نمایاں دلیل یہ ہے کہ آیت اور اُس کا سیاق و سباق اللہ کی طرف سے بشارت اور وعدۂ نصرت کو نمایاں کر رہا ہے۔ موت کے معنی لینے کی صورت میں یہ واقعہ بشارت اور نصرت کا مظہر نہیں بنتا۔ اِس کے بجاے یہود کی خواہش کا مظہر بن جاتا ہے۔ اِس دلیل کو چونکہ دیگر اہل علم نے بھی اختیار کیا ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ اِس پہلو سے استاذِ گرامی کے موقف کو قدرے تفصیل سے سمجھ لیا جائے۔ اِسے ہم درجِ ذیل دو نکات میں واضح کرتے ہیں:

ا۔ رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت ہے کہ جب اُن کی مخاطب قوم پر اتمام حجت ہو جاتا ہے تو رسول کی اصل ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد منکرین کے لیے سزا اور مومنین کے لیے جزا کا وقت آ جاتا ہے۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ قوم کے حالات کے لحاظ سے رسول کی زندگی کے بارے میں فیصلہ فرماتے ہیں۔ اگر جزا و سزا کو رسول کے سامنے برپا کرنا مقصود ہو تو اُسے زندہ رکھا جاتا ہے، وگرنہ اُسے وفات دے دی جاتی ہے۔ سورۂ مومن اور سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اِسی سنت سے آگاہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ	”(یہ نہیں مان رہے، اے پیغمبر)، تو صبر کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ

نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ. (المومن 77:40)	اللہ کا وعدہ بر حق ہے۔ پھر جس عذاب کی وعید ہم اِنھیں سنا رہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھا دیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہر کیف اِن کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے۔"
وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ. (یونس 46:10)	"ہم جس چیز کا وعدہ اُن سے کر رہے ہیں، اُس کا کوئی حصہ ہم تمھیں دکھائیں، (اے پیغمبر)، یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں، بہر کیف اِن کو لوٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر اللہ اُس پر گواہ ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔"

امام امین احسن اصلاحی نے اِس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب سے اُن کو ڈرایا جا رہا ہے اور یہ اُس کے مؤخر ہونے کے سبب سے اُس کو خالی خولی دھمکی سمجھ رہے ہیں اور تمھیں زچ کرنے کے لیے اُس کی جلدی مچائے ہوئے ہیں، اگر حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی تو تمھاری زندگی ہی میں اُن کو اِس کا کچھ حصہ دکھا دیا جائے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھیں وفات دے گا اور اُن کی واپسی ہماری طرف ہو گی۔ پھر اللہ اُن کا سارا کچا چٹھا اُن کے سامنے رکھ دے گا۔" (تدبر قرآن 4/ 60)

عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں یہ مرحلہ اُس وقت آیا، جب بنی اسرائیل اپنی منصوبہ بندی کو روبہ عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ اِس موقع پر اللہ نے وفات کی صورت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اللہ نے آپ کے لیے اپنی نصرت و بشارت کا یہ اعلان فرمایا کہ

وہ آپ کی روح کو قبض کر لیں گے اور آپ کی ذاتِ اقدس کو منکرین سے پاک کریں گے۔ بنی اسرائیل کی جزا و سزا کا معاملہ اِس طرح ہو گا کہ آپ کے ماننے والے — نصاریٰ — قیامت تک آپ کے منکرین — یہود — پر غالب رہیں گے۔ ارشاد ہے:

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ. اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.

(آل عمران 3:54-55)

"اور بنی اسرائیل نے (اُس کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں، اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔"

ب۔ جب اللہ کا رسول اپنے منکرین پر حجت تمام کر دیتا ہے اور وہ اُس کے دلائل و براہین کے آگے بالکل زچ ہو جاتے ہیں تو وہ رسول سے چھٹکارا پانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اِس خبث اور کم ظرفی کے لیے اُنھیں عموماً دو ہی راستے سجھائی دیتے ہیں: یا وہ پیغمبر کو جلا وطن کر دیں یا اُس کے قتل کے درپے ہو جائیں۔ قرآن سے واضح ہے کہ رسولوں کی قوموں نے یہ دونوں طریقے اختیار کرنے کی جسارت کی ہے۔ سورۂ ابراہیم میں جہاں اللہ کے رسولوں کی سرگذشت بیان ہوئی ہے، وہاں کفار کی طرف سے رسولوں کو جلا وطن کر دینے کی دھمکی بھی

نقل ہوئی ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ.(13:14)

"اِس پر منکروں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تم کو اپنی اِس سرزمین سے لازماً نکال دیں گے یا تمھیں بالآخر ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ تب اُن کے پروردگار نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ ہم اِن ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔"

امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

"ہر رسول کی زندگی میں بالآخر یہ مرحلہ بھی پیش آیا ہے کہ اُس کی دعوت سے تنگ آ کر اُس کی قوم نے اُس کو یہ نوٹس دے دیا کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آ جاؤ، ورنہ ہم تمھیں اپنی سرزمین سے جلاوطن کر دیں گے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بہ ذریعہ وحی اپنے رسولوں کو یہ بشارت دے دی ہے کہ ہم اِن ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور اِن کے بعد تمھیں زمین میں بسائیں گے۔" (تدبر قرآن 4/317)

سورۂ بنی اسرائیل میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کفارِ قریش کی اِنھی کارستانیوں کا ذکر آیا ہے:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا.(76:17)

"یہ اِس سرزمین سے تمھارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو تمھارے بعد یہ بھی کچھ زیادہ دیر ٹھیرنے نہ پائیں گے۔"

اِسی طرح یہ بات بھی معلوم و معروف ہے کہ جس رات آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی، اُس رات کفارِ قریش نے آپ کے قتل کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملے میں تو یہ اقدام کر بھی دیا گیا تھا۔ سورۂ عنکبوت میں بیان ہوا ہے کہ جب اُن کی قوم کے پاس اُن کی دعوت کا کوئی جواب نہ رہا تو اُس نے اُنھیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس پر عمل درآمد بھی کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں پوری طرح محفوظ رکھا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ....(24:29)	”سو (ابراہیم نے اپنی دعوت پیش کی تو) اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے: اِسے قتل کر دو یا جلا دو۔ پھر اللہ نے اُس کو آگ سے بچا لیا...۔“

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ہے تو بنی اسرائیل نے اُنھیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے سازشی منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کو قرآن نے 'وَ مَكَرُوْا' (اُنھوں نے خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ویسا ہی منصوبہ تھا، جیسا اُن سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے بعد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُن کی قوم کے لوگوں نے بنایا تھا۔ چنانچہ دیکھیے، قرآن نے حضرت مسیح کے قتل کی سازش کے لیے 'مَكَر' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف کی گئی سازش کے لیے 'كيد' (چال) کا لفظ استعمال کیا ہے۔[118] سورۂ صافات میں ارشاد فرمایا ہے:

---

[118] استاذِ گرامی نے 'كيد' کی وضاحت میں لکھا ہے:

”یعنی آتش کدہ بنا کر کسی بہانے سے اُن کو اُس میں پھینکنا چاہا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو گی کہ علانیہ اقدام کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے مزاحمت کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں بھی قریش کے سرداروں کو اِسی طرح کی تدبیر کرنی پڑی تھی۔“ (البیان 4/ 274)

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ. (98:37)	”سو اُنھوں نے اُس کے ساتھ چال کرنی چاہی تو ہم نے اُنھی کو نیچا دکھا دیا۔“

اللہ کے رسولوں کے ساتھ جب اُن کی قومیں ایسا بہیمانہ سلوک اختیار کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں تو اللہ اُس کے بعد اپنے رسولوں کو محفوظ کر کے اُن قوموں کا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے۔ اِس موقع پر رسول کو اُس قوم سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ الگ کرنے کی صورت بہ شکل حیات ہجرت الی الارض بھی ہو سکتی اور بہ شکل وفات ہجرت الی السماء بھی ہو سکتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں یہ ہجرت الی اللہ ہوتی ہے، جس کا اظہار اُس کے حکم سے اور اُس کی حکمتِ عملی کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآن نے اِسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ’مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ‘ اور ’ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ‘ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وہ موقع تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اُن کو قتل کر دینے اور آگ میں جلا دینے کے درپے ہو گئی تھی:

... وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ. (العنکبوت 26:29)	”... ابراہیم نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک، وہی زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔“
وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ. (الصافات 99:37)	”ابراہیم نے کہا: (تم لوگوں کو چھوڑ کر اب) میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔“

استاذِ گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اِس ہجرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اپنی قوم پر اتمام حجت کے بعد یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہجرت کے فیصلے کا اظہار ہے۔ لوگ داعی حق کی جان کے درپے ہو جائیں تو انبیا علیہم السلام کو اِسی

طرح ہجرت کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ آگے کیا پیش آئے گا، اِس طرح کے موقعوں پر اِس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر قدم پر ضرورت ہوتی ہے کہ وہی پروردگار رہنمائی فرمائے، جس کے بھروسے پر اتنا بڑا فیصلہ کیا گیا ہے۔" (البیان 4/ 275)

حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوموں پر اتمام حجت کے بعد جب اللہ کے عذاب کا فیصلہ ہوا تو اِن رسولوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں سے الگ کر لیا۔ حضرت لوط کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کے سوا باقی اہل و عیال کو لے کر اِس قوم کے مسکن سے دور نکل جائیں۔ حضرت شعیب کے حوالے سے فرمایا کہ ہم نے شعیب کو اور اُن پر ایمان لانے والوں کو ظالموں سے نجات عطا فرمائی ہے۔ سورۂ ہود میں بیان ہوا ہے:

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ.(81:11)

"فرشتوں نے کہا: اے لوط، ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ تمھارے قریب بھی نہیں آسکیں گے۔ سو اپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمھاری بیوی نہیں، اِس لیے کہ اُس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔ اِن (پر عذاب) کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے؟"

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ

"(اِس پر) جب ہمارا حکم صادر ہو گیا تو ہم نے شعیب کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، خاص

فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِھِمۡ جٰثِمِیۡنَ. (94:11)

اپنی رحمت سے نجات دی اور جنھوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا، اُن کو کڑک نے آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔''

حضرت مسیح علیہ السلام کو بنی اسرائیل سے نجات دلانے اور اللہ کی طرف ہجرت کرنے کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ اللہ نے آپ کو وفات دی اور آپ کے جسم مبارک کو اُن سے الگ کر کے اپنی طرف اٹھا لیا۔[119] سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا ہے:

... وَ مَا قَتَلُوۡہُ وَ مَا صَلَبُوۡہُ وَ لٰکِنۡ شُبِّہَ لَھُمۡ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ ؕ مَا لَھُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًۢا. بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا.(158-157:4)

''... اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں، وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔''

ان آیات میں سے 'بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ' سے مراد اللہ کا سیدنا مسیح علیہ السلام کی روح قبض کر کے اُن کے جسم کو بنی اسرائیل کے اندر سے اٹھا لینا ہے۔ استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

''اِس رفع کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران (3) کی آیت 55 میں اِس طرح

---

[119] ایسا اِس لیے کیا گیا کہ مبادا بنی اسرائیل آپ کے وجود کی بے حرمتی کی جسارت کریں۔

فرمائی ہے کہ وفات کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی طرف اٹھالیں گے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ روح قبض کر کے اُن کا جسم بھی اٹھالیا جائے گا تاکہ اُن کے دشمن اُس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک اُن کا مشن پورا نہ ہو جائے، اُن کے دشمن ہرگز اُن کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اُن کی توہین و تذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتا اور جو لوگ اِس کے درپے ہوں، اُنھیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً اُن کی دست درازی سے محفوظ کر دیتا ہے۔"(البیان 1 / 573)

3۔ 'وَرَافِعُكَ اِلَيَّ' کا مفہوم

آلِ عمران کی زیرِ بحث آیت کے الفاظ 'وَرَافِعُكَ اِلَيَّ' (اور میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا) سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ الفاظ 'توفی' کو موت کے معنی پر محمول کرنے میں مانع ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موت کی صورت میں روح و بدن پر مشتمل وہ وجود ہی باقی نہیں رہتا، جس پر رفع، یعنی اٹھانے کا فعل موثر ہو سکے۔ اِس صورت میں 'ك' کی ضمیرِ مفعولی بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ اُس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جو زندگی کی صورت میں تو عیسیٰ علیہ السلام رہتے ہیں، مگر موت کی صورت میں اُن کا ذاتی تشخص باقی نہیں رہتا، بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح اور عیسیٰ علیہ السلام کے جسد کے دو علیحدہ اجزا میں منقسم ہو جاتا ہے۔

یہ دلیل بجائے خود زبان و بیان اور قرآنِ مجید کے عرف کے خلاف ہے۔ اِس میں یہ حقیقت نظر انداز ہوئی ہے کہ زبان نطق ہے، منطق نہیں ہے۔ زبان کے مدعا و مفہوم کو ریاضی کے اصولوں کی طرح علت و معلول سے نہیں طے کیا جاتا، بلکہ عرف و استعمال کی بنا پر سمجھا جاتا ہے۔ معروف اور مستعمل اسالیب کو نظر انداز کیا جائے تو زبان چیستاں بن جاتی اور اپنے بنیادی وظیفے ابلاغ کو ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

چنانچہ دیکھیے کہ اگر ایک صاحب مذکورہ آیت کے الفاظ 'وَرَافِعُكَ اِلَيَّ' (اور میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا) سے یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ اِس میں 'رفع' کے فعل کا اطلاق عیسیٰ علیہ

السلام پر ہوتا ہے، جو روح و بدن کا مجموعہ ہیں، لہٰذا اِن سے آپ کا زندہ اٹھایا جانا لازم آتا ہے تو اِسی اصول پر دوسرے صاحب اِس کے الفاظ 'ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ' (پھر تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے) سے یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ اِن میں 'رجع' کے فعل کا مفعول یہود و نصاریٰ سمیت سب مخاطبین ہیں، جو روح و بدن کا مجموعہ ہیں، اِس لیے اِن سے اُن سب کا زندہ لوٹایا جانا ثابت ہوتا ہے۔

تفہیم مدعا کے لیے اِن جملوں کو آیت کے اندر بھی دیکھ لیجیے:

وَ مَکَرُوۡا وَ مَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ. اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَجَاعِلُ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡکَ فَوۡقَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ.

(آل عمران 3:54-55)

"اور بنی اسرائیل نے (عیسیٰ ابن مریم کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں، اور اللہ نے بھی (اِس کے جواب میں) خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا، جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔"

اِس بحث کے حوالے سے استاذِ گرامی کا موقف یہ ہے کہ نہ 'رفع' کا معنی جملے کی تالیف

سے مجرد ہو کر طے کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس مجرد معنی کی روشنی میں قبل و بعد کے اجزا کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ 'رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے دونوں اجزا کے معنی اِن کے معطوف علیہ 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' کی بنا پر طے ہوں گے۔ چنانچہ جب 'توفی' کے معنی قطعی طور پر قبض روح، یعنی وفات کے ہیں تو بعد کے الفاظ سے ایسا مفہوم اخذ کرنے کی گنجایش نہیں ہے، جو وفات کے خلاف یا اُس سے مغائر ہو۔ استاذِ گرامی نے اِسی بنا پر 'رَافِعُكَ' کی ضمیرِ خطاب کا اطلاق عیسیٰ علیہ السلام کے جسد پر کیا ہے، جس میں سے روح کو قبض کر لیا گیا تھا۔ اُن کے نزدیک مسیح علیہ السلام کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اِس وجہ سے کیا گیا کہ آپ کے جسدِ اطہر کو ہر طرح کی دست برد اور اہانت سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

> "یعنی روح قبض کر کے تیرا جسم بھی اپنی طرف اٹھا لوں گا تاکہ یہ ظالم اُس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ اُن کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک اُن کا مشن پورا نہ ہو جائے، اُن کے دشمن ہرگز اُن کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اُن کی توہین و تذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتے اور جو لوگ اِس کے درپے ہوں، اُنھیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً ان کی دستبرد سے محفوظ کر دیتے ہیں۔ (البیان 1/ 359)

جہاں تک 'وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے الفاظ کا تعلق ہے تو اُن کے نزدیک اِس کا اطلاق مسیح علیہ السلام کی پوری شخصیت پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہود کے باطل عقائد اور رذیل اخلاق کی نجاست سے دور کر کے اپنی پاکیزہ دنیا میں لے جائیں گے:

> "یعنی علم و عقل اور سیرت و کردار کی نجاست میں مبتلا اِن لوگوں سے الگ کر کے تمھیں صالحین و ابرار کی اُس دنیا میں لے جاؤں گا، جو اُنھی کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

(البیان 1/ 359)

4۔ ’قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‘ سے مراد

سورۂ نساء (4) ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ وہ موقع ہے، جب مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست قائم ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب پر اتمام حجت اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر کر رہے تھے۔ چنانچہ اِس کا موضوع امتِ مسلمہ کے لیے صالح معاشرت کی اساسات اور اُس کا تزکیہ و تطہیر ہے۔[120]

اِس سورہ کی 176 آیات ہیں۔ تاہم، اِس کا مضمون آیت 126 پر مکمل ہو گیا ہے۔ تکمیل مضمون کی آیات یہ ہیں:

وَ مَنۡ اَحۡسَنُ دِیۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِیۡمَ خَلِیۡلًا. وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطًا. (125-126)

”(ایمان والوں کے مقابلے میں یہ منافق مشرکوں کو ترجیح دیتے ہیں) اور (نہیں سمجھتے کہ) اُس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور اچھے طریقے سے عمل کرنے والا ہو اور ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرے جو بالکل یک سو تھا —

[120] البیان 1 / 442۔

اور ابراہیم کو اللہ نے (اِسی بنا پر) اپنا
دوست بنایا تھا۔ (اللہ کے سوا کون اِس کا
حق دار ہے کہ اپنے آپ کو اُس کے
حوالے کر دیا جائے، اِس لیے کہ)
زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اللہ
کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے
ہے۔"

اِس سے آگے سورہ کے اختتام تک ایک ضمیمہ ہے، جس میں اُن سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، جو سورہ کے نزول کے دوران میں لوگوں کی طرف سے سامنے آئے ہیں۔

اِن میں پہلا سوال اُن مسلمانوں نے کیا ہے، جو ایمان و اخلاق کے تقاضے پورے کرنے میں کچھ کم زور تھے۔ یہ سوال آیت 127 میں 'وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ' (وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں) کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سوال یتیموں کی ماؤں سے نکاح کی صورت میں اُن کے مہر اور عدل سے متعلق ہے۔ اِس کا جواب آیت 134 تک بیان ہوا ہے۔

دوسرا سوال منافقین کے طرزِ عمل سے نمایاں ہے۔ وہ اہل کتاب کے ساتھ اپنے تعلقات کو حق و صداقت پر ترجیح دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ اللہ نے مشرکین کے ساتھ یہود و نصاریٰ کو بھی کیوں عذاب کا مستحق قرار دیا ہے؟ آیت 152 تک اُن کا جواب ارشاد فرمایا ہے۔

تیسرا سوال اہل کتاب نے ایک مطالبے کی صورت میں کیا ہے۔ اِس کا جواب آیت 175 تک ہے۔

چوتھا اور آخری سوال سورہ کے آغاز میں بیان کیے گئے میراث کے احکام سے متعلق ہے۔ اِس کا جواب سورہ کے اختتام پر آیت 176 میں دیا ہے۔

تیسرا سوال جو اہل کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مطالبے کی صورت میں کیا تھا، اُسے قرآن نے آیت 153 میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ....	”یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجائے) اِن پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ...۔“

اِس کا جواب اللہ تعالیٰ نے انتہائی سخت اسلوب میں دیا ہے اور پورے زورِ کلام کے ساتھ یہود کے بدترین جرائم کی فہرست گنوادی ہے۔ اِس سوال وجواب کے حوالے سے استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

”یہ تیسرا سوال ہے، جو اِس سورہ کی دعوت کے جواب میں اہل کتاب کے اِس مطالبے کی صورت میں سامنے آیا ہے کہ اُنھیں قرآن نہیں، بلکہ ایک ایسی کتاب چاہیے، جو آسمان سے براہِ راست نازل کی جائے۔ وہ اِس کے بعد ہی ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اِس کا جواب اِس قدر سخت اور شدید تنبیہ کے ساتھ دیا گیا ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں لفظ لفظ سے جوشِ غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... پوری تقریر ازابتدا تاانتہا صرف فرد قرارداد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوئی۔ اِس قسم کے پرجوش اور پرغضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے۔“ (تدبر قرآن 2/415)۔“ (البیان 1/567-568)

اِس فرد قراردادِ جرائم میں یہود کی جن مجرمانہ سرگرمیوں کو بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہیں:

1۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اللہ کو کھلم کھلا دکھاؤ۔ (آیت 153)

2۔ اُنھوں نے واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود بچھڑے کو معبود بنالیا۔ (آیت 153)

3۔ اللہ نے اُن کے سروں پر طور کو معلق کر کے یہ عہد لیا کہ وہ خیمۂ عبادت میں سر جھکا کر داخل ہوں گے اور سبت کے دن کی بے حرمتی نہیں کریں گے، مگر اُنھوں نے اِس پختہ عہد کو توڑ ڈالا۔ (آیت 154)

4۔ اُنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ (آیت 155)

5۔ اُنھوں نے انبیا کو بے گناہ قتل کیا۔ (آیت 155)

6۔ اُنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے دلوں کے دروازے تو تمھاری باتوں کے لیے بند ہیں۔ (آیت 155)

7۔ اُنھوں نے بہ حیثیتِ مجموعی کفر کو اختیار کیا۔ (آیت 156)

8۔ اُنھوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان لگایا۔ (آیت 156)

9۔ اُنھوں نے اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ (آیت 157)

10۔ اُنھوں نے اللہ کے منع کرنے کے باوجود سودی کاروبار کو جاری رکھا۔ (آیت 161)

11۔ وہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے رہے۔ (آیت 161)

یہ اہل کتاب کے جرائم کی فہرست ہے۔ اُن کے سوال سے واضح ہے کہ یہ اُن کے مطالبے کا جواب نہیں ہے، کیونکہ مطالبہ تو یہ ہے کہ اللہ اِس قرآن کے بجائے اُن پر براہِ راست کتاب نازل فرمائے۔ یہ اللہ کے شدید عتاب کا اظہار ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ اُن کی کم ظرفی، ذلالت اور بے مروتی کا بدترین اظہار تھا۔ چنانچہ اللہ نے پوری شانِ کلام کے ساتھ اُن کا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیا اور بین السطور یہ بتا دیا کہ جو لوگ اِس سے پہلے اِس سے بھی بڑے مطالبات کرتے رہے ہیں اور اللہ کی عظیم الشان نشانیاں دیکھنے کے باوجود سرکشی ہی پر قائم

رہے ہیں، وہ اِس روش سے باز آنے والے نہیں ہیں۔

اِس فرد قرار دادِ جرم میں نواں (9) جرم یہ بیان ہوا ہے کہ اُنھوں نے اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں — جو منصبِ رسالت پر فائز ہونے کی وجہ سے اللہ کی براہِ راست حفاظت میں تھے اور جن کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا — یہ دعویٰ کیا کہ وہ اُنھیں قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ دعویٰ چونکہ اللہ کے قانونِ رسالت کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا، اِس لیے ساتھ ہی پورے زور سے اِس کی تردید کر دی اور ارشاد فرمایا:

... وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ....

(158-157:4)

”... دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں، وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا...۔“

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ درجِ بالا جملہ اگلے جملے سے نہیں، بلکہ پچھلے جملے سے متعلق ہے، جو بنی اسرائیل کی فہرست جرائم میں سے نویں جرم کا بیان ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ....(157:4)

”اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے...۔“

اب سوال یہ ہے کہ آیت 159 کے ارشاد سے کیا مراد ہے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ

بنی اسرائیل کے اُس مطالبے کا جواب ہے، جو سلسلۂ کلام کے آغاز میں اِن الفاظ میں آیا ہے:

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ....(153:4)

"یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجائے) اِن پر براہ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ...۔"

اِس کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا.(159:4)

"(اب قرآن کے سوا یہ براہِ راست آسمان سے اتری ہوئی کسی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اِن کی پروانہ کرو، اے پیغمبر)، اِن اہل کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کر لے گا اور قیامت کے دن یہ (قرآن) اِن پر گواہی دے گا۔"

آخر میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ اِس عتاب سے اہل کتاب کے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں، جو قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف قرآن کو کتابِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اِس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو بھی من جانبِ اللہ سمجھتے ہیں۔ ارشاد ہے:

لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَ الۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا.(162:4)

"اِن میں سے، البتہ جو علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان والے ہیں، وہ اُس چیز کو مانتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور خاص کر نماز کا اہتمام کرنے والے ہیں، اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور

قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے
ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم عنقریب
اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔‘‘

اس تفصیل کے مطابق کلام کی ترتیب اِس طرح سے سامنے آتی ہے:

1۔ بنی اسرائیل کا رسول اللہ سے مطالبہ: قرآن کے بجائے اُن پر براہِ راست کتاب نازل کی جائے۔

2۔ پہلا جملۂ معترضہ:[121] اللہ کا اِس ناجائز مطالبے پر غصے اور زجر وتہدید کے اظہار کے

---

[121] جملۂ معترضہ سے مراد سلسلۂ کلام کے درمیان میں آنے والی کوئی تعلیق یا وضاحت ہوتی ہے، جو کلام کے متعلقہ حصے سے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ سلسلۂ کلام سے منفرد ہوتی ہے۔ گویا اگر یہ اُس سے الگ ہو جائے تو کلام کے تسلسل میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

جملۂ معترضہ کیا ہوتا ہے؟ کیسے وہ کلام کے درمیان میں داخل ہوتا ہے؟ وہ مجموعی کلام سے کس قدر متعلق اور کس قدر غیر متعلق ہوتا ہے؟ اِن چیزوں کو سمجھنے کے لیے علامہ اقبال کی مشہور نظم ’’جواب شکوہ‘‘ کے درجِ ذیل حصے پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اِس میں مسلمانوں کی کوتاہیوں اور کم زوریوں کی ایک فہرست بیان ہوئی ہے۔ اِنھیں بیان کرتے ہوئے دو جملہ ہاے معترضہ بھی درمیان میں آگئے۔ کلام خود بتا دیتا ہے کہ یہ جملے فردِ اعمال کا حصہ نہیں ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

لیے اُن کی فردِ جرائم کا بیان۔

3۔ اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل کے سوال کا جواب: یہ اعلان کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین اہل کتاب میں سے ہر فرد اپنی موت سے پہلے قرآن کے کتاب الٰہی

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا
نازشِ موسم گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا، اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمھارا یہی ہرجائی تھا
کسی یک جائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لو
کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھی کہہ دو، یہی آئین وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں
جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچوگے، جو مل جائیں صنم پتھر کے!

ہونے پر یقین کر لے گا۔

4۔ دوسرا جملۂ معترضہ: فردِ جرائم میں چند مزید جرائم کا اضافہ۔

5۔ اہلِ کتاب میں سے قرآن کو کتابِ الٰہی ماننے والوں پر تبصرہ: اُن کی تحسین اور اُن کے لیے اجرِ عظیم کا اعلان۔

اِس تناظر میں اب ایک بار پورے کلام کو پڑھ لیجیے تاکہ زیرِ بحث آیت کا مدعا و مفہوم پورے سیاق و سباق کے ساتھ واضح ہو جائے۔ تفہیم مدعا کے لیے کلام کے اصل اجزا کو نمایاں کر دیا ہے:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا. وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا. فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا. وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا. وَّ

”یہ اہلِ کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجائے) اِن پر براہ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ —— سو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اِنھوں نے موسیٰ سے اِس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ اِنھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں خدا کو سامنے دکھاؤ تو اِن کی اِس سرکشی کے باعث اِن کو کڑک نے آ لیا تھا۔ پھر اِنھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اِس کے بعد کہ اِن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آ چکی تھیں۔ اِس پر بھی ہم نے اِس سے درگذر کیا اور موسیٰ کو (اِن پر) صریح غلبہ عطا فرمایا تھا۔ اور ہم نے طور کو اِن پر اٹھا لیا تھا، اِن سے عہد کے ساتھ اور اِن کو حکم دیا تھا کہ (شہر

قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا. فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا. وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا. لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا.

(162-153:4)

کے) دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہوں اور اِن سے کہا تھا کہ سبت کے معاملے میں نافرمانی نہ کرنا اور (اِن سب چیزوں پر) ہم نے اِن سے پختہ عہد لیا تھا۔ پھر اِن کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے (ہم نے اِن پر لعنت کر دی)، اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے اللہ کی آیتوں کو نہیں مانا اور اِن کے نبیوں کو ناحق قتل کر دینے کی وجہ سے اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف ہیں — نہیں، بلکہ اِن کے کفر کی پاداش میں اللہ نے اِن کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اِس لیے (اب) یہ کم ہی ایمان لائیں گے —۔ اور اِن کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بہتان عظیم لگانے کی وجہ سے۔ اور اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے — دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں، وہ اِس معاملے

میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو
اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ
صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے
ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں
کیا۔ بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا
لیا تھا اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی
حکمت والا ہے۔ ——(یہ اِن کے جرائم
ہیں، اِس لیے اب قرآن کے سوا یہ
براہ راست آسمان سے اتری ہوئی کسی
کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اِن کی
پروانہ کرو، اے پیغمبر)، اِن اہل کتاب
میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے
لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کرلے گا اور
قیامت کے دن یہ اِن پر گواہی دے
گا۔ ——پھر اِن یہودیوں کے ظلم ہی
کی وجہ سے ہم نے ایسی پاکیزہ چیزیں
بھی اِن پر حرام کردی تھیں جو اِن کے
لیے حلال تھیں اور اِس وجہ سے کہ یہ
اللہ کی راہ سے بہت روکتے رہے ہیں۔
اور اِس وجہ سے کہ سود لیتے رہے ہیں،
دراں حالیکہ اِنھیں اِس سے روکا گیا تھا
اور اِس وجہ سے کہ یہ لوگوں کا مال
باطل طریقوں سے کھاتے رہے ہیں،

اور یہ اِنھی کے منکرین ہیں جن کے
لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر
رکھا ہے۔ اِن میں سے، —— البتہ جو
علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان والے
ہیں، وہ اُس چیز کو مانتے ہیں جو تمھاری
طرف اتاری گئی اور جو تم سے پہلے
اتاری گئی ہے اور خاص کر نماز کا اہتمام
کرنے والے ہیں، اور زکٰوۃ دینے
والے اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر
ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ
ہیں جنھیں ہم عنقریب اجر عظیم عطا
فرمائیں گے۔"

اِس توضیح و تفصیل سے آیت 159 کے جملہ ضمائر کا مرجع پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ اِس کے مطابق:

'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ' میں واحد مذکر غائب کی ضمیر کا مرجع قرآنِ مجید ہے۔

'قَبْلَ مَوْتِهٖ' میں واحد مذکر غائب کی ضمیر کا مرجع زمانۂ رسالت میں سرزمین حجاز میں بسنے والے اہل کتاب کا ہر فرد ہے۔

'يَكُوْنُ' کا فاعل قرآنِ مجید ہے۔

'عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا' میں جمع مذکر غائب کی ضمیر کا مرجع زمانۂ رسالت میں سرزمین حجاز میں بسنے والے اہل کتاب ہیں۔

یہ مذکورہ آیت کے حوالے سے جناب جاوید احمد غامدی کا موقف ہے۔

اِس پر اگر کوئی شخص یہ سوال اٹھائے کہ غامدی صاحب نے اِن ضمائر کے مراجع کا تعین

کس بنا پر کیا ہے؟ تو اِس کا قطعی جواب یہ ہے کہ اُنھوں نے اِس کا تعین اُسی بنا پر کیا ہے، جس بنا پر کسی بھی کلام میں کیا جاتا ہے۔

زبان و بیان کا مسلمہ ہے کہ کسی کلام میں ضمیروں کے مراجع کا فہم اُس کے موضوع، اُس کے سیاق و سباق اور اُس کے قرائن سے حاصل ہوتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ضمیر کلام میں پہلے سے مذکور اِسم کے قائم مقام کے طور پر آتی ہے۔ یعنی جب ''اُس''، ''اُن'' یا ''ہ''، ''ھم'' جیسے الفاظ بولے جاتے ہیں تو اُن سے پہلے اُن اسما کا ذکر لازماً آتا ہے، جن کی جگہ پر اُنھیں بولا گیا ہے۔ اِن کی تعیین میں اگر احتمال یا التباس ہو تو اِنھیں کلام کے سیاق و سباق اور موضوع و مدعا کی مدد سے طے کر لیا جاتا ہے۔ اِنھی اجزا کے لیے قرائن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

استاذِ گرامی نے 'لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ' کی ضمیر کا مرجع قرآنِ مجید کو اور 'قَبۡلَ مَوۡتِهٖ' کی ضمیر کا مرجع ہر اُس اہل کتاب کو قرار دیا ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا براہِ راست مخاطب تھا۔ اِس تعیین کے لیے کلام کے قرائن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا قرینہ، کلام کی ابتدا میں آنے والا 'يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ' (یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اِن پر براہ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ) کا جملہ ہے۔ اِس میں پورے کلام کا مضمون بیان ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس بات کو اپنے تبصرے کے لیے منتخب فرمایا ہے، وہ اہل کتاب کا یہ تقاضا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قلب پر نازل ہونے والی کتاب قرآن کے بجاے کوئی ایسی کتاب پیش کریں، جو بنی اسرائیل پر براہِ راست نازل ہو رہی ہو۔ کلام شاہد ہے کہ اُس کا باقی حصہ اُسی مطالبے پر اللہ کی سرزنش کا اظہار ہے۔

اِس جملے سے موضوعِ زیرِ بحث کے فہم کے ساتھ ساتھ درجِ ذیل معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں:

1۔ 'يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ مطالبہ کرنے والے اہل کتاب وہ یہود و

نصاریٰ ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ دعوت میں سرزمین حجاز میں موجود تھے۔

2۔ 'اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ وہ قرآن کو آسمان سے نازل ہونے والی کتاب کے طور پر قبول نہیں کر رہے، کیونکہ وہ اُن (یہود) پر نازل نہیں ہو رہی۔

3۔ 'كِتٰبًا' کی تنکیر سے واضح ہے کہ اہل کتاب جس کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ قرآن کے بجائے کوئی اور ہے۔

اِس قرینے سے واضح ہے کہ کلام کا زیرِ بحث موضوع اہل کتاب کے قرآن پر یقین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ ہے۔

دوسرا قرینہ، کلام کے آخر میں آنے والے یہ الفاظ ہیں: 'لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَ الۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا' (اِن میں سے، البتہ جو علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان والے ہیں، وہ اُس چیز کو مانتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور خاص کر نماز کا اہتمام کرنے والے ہیں، اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں، جنھیں ہم عنقریب اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے)۔

اِس حصے میں اہل کتاب کے اُن لوگوں کا ذکر ہے، جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب، قرآنِ مجید کے منزل من اللہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے اہل کتاب میں دو طرح کے لوگ تھے۔ اکثریت اُن لوگوں کی تھی، جو قرآن کو کتاب الٰہی ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ تاہم، اُن کے اہل علم اور اہل ایمان میں ایسے افراد موجود تھے، جو قرآن کو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب تسلیم کرتے تھے۔

اِس قرینے سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ کلام کا موضوع اہل کتاب کے قرآن پر

یقین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ ہے۔

اِس جملے سے کلام کے موضوع کے فہم کے ساتھ ساتھ درجِ ذیل حقائق بھی واضح ہوتے ہیں:

1۔ 'لٰکِنِ' کا حرف جو عطف اور استدراک کا فائدہ دیتا ہے، اِس امر کا متقاضی ہے کہ اگر اُس کے بعد اہل کتاب کے اُس گروہ کی بات ہوئی ہے، جو قرآن کو کتاب الٰہی مان رہا ہے تو اُس سے پہلے اُن کے اُس گروہ کا ذکر ہونا چاہیے، جو قرآن کو کتابِ الٰہی نہیں مان رہا۔

2۔ 'مِنۡهُمۡ' کی ضمیر دلالت کرتی ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہونے چاہییں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اور اوپر جن کا ذکر ہوا ہے، وہ زمانۂ رسالت کے اہل کتاب ہیں۔

3۔ 'يُؤۡمِنُوۡنَ' کا لفظ چونکہ اُن اہل کتاب کے لیے آیا ہے، جو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قرآن کو کتاب الٰہی کے طور پر تسلیم کر رہے ہیں، اِس لیے اِس کے معنی یقین کرنے یا ماننے کے ہوں گے۔ اِسے ایمان کے مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا۔

4۔ 'سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا' کے الفاظ میں زمانۂ رسالت کے اہل کتاب میں سے قرآن کو کتاب الٰہی ماننے والوں کا انجام مذکور ہے۔ یہ اسلوب تقاضا کرتا ہے کہ اہل کتاب کے اُن لوگوں کے انجام کا ذکر بھی ہونا چاہیے، جو قرآن کو کتابِ الٰہی نہیں مان رہے۔ چنانچہ اُنھی کا انجام آیت 159 میں بیان ہوا ہے کہ جس قرآن کو اِس وقت وہ اللہ کی کتاب ماننے سے انکار کر رہے ہیں، بالآخر اُنھیں اِس کے من جانبِ اللہ ہونے پر یقین کرنا پڑے گا۔ یہ واقعہ اُن کی زندگیوں میں اُس وقت رونما ہو گا، جب اللہ کے رسول کی طرف سے حجت تمام ہو جائے گی اور جس امر کا دعویٰ قرآن کر رہا ہے، وہ مشہود حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔ استاذِ گرامی نے اِس پہلو کو واضح کرتے ہوئے آیت 159 کے تحت لکھا ہے:

> ”یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ تہدید اور وعید کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جو باتیں اِنھیں دلیل سے سمجھائی جا رہی ہیں، وہی آنے والے دنوں میں واقعہ بن جائیں گی۔ اِنھیں سوچنا چاہیے کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے۔ ماننے کے سوا اُس وقت اِن کے لیے کوئی

چارہ نہ ہو گا۔"(البیان 1/ 574)

سورۂ نساء کی آیت 159 کی تاویل کے حوالے سے یہ استاذِ گرامی کے موقف کی تفصیل ہے۔ اُن کے نزدیک کلام کا موضوع، ترتیبِ بیان، جملوں کا در و بست، آیت کا سیاق و سباق جس واحد تاویل کو قبول کرتا ہے، وہ یہی ہے۔

استاذِ گرامی کے موقف کی وضاحت کے بعد اب عام موقف میں پائی جانے والی غلطی کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔

نساء کی آیت 159 کی تاویل میں ہمارے علما کا عام موقف یہ ہے کہ اِس کے الفاظ 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ' میں دونوں مفعولی ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اِس کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہو گا:

اہل کتاب میں سے ہر شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لازماً ایمان لائے گا۔

تاویل کی اِس غلطی کا سبب اِس سے پہلے آیات 157-158 میں مذکور یہ الفاظ ہیں:

...وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا.

"... دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔ اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں، وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے ہر گز اُس کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا اور اللہ زبردست ہے،

وہ بڑی حکمت والا ہے۔"

یہ ٹکڑا اصل میں اُس جملۂ معترضہ کا حصہ ہے، جس کا آغاز 'فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جس میں بہ طورِ تہدید بنی اسرائیل کی فرد قرار دادِ جرم بیان ہوئی ہے۔ اِس جملۂ معترضہ کا اختتام 'عَزِيْزًا حَكِيْمًا' کے الفاظ پر ہوا ہے۔ 'وَمَا قَتَلُوْهُ' سے 'عَزِيْزًا حَكِيْمًا' تک کا جملہ بھی تہدید والے جملۂ معترضہ کے اندر ایک اور جملۂ معترضہ ہے۔ اِس اضافی جملۂ معترضہ کی ضرورت کیوں پیش آئی، اِس کی وضاحت میں امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اِس میں یہود کے دعوائے قتل مسیح کی فوری تردید کر دی گئی ہے۔ اِس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اُس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، اُن کے خلاف اُس کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اِس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ اُنھوں نے اُن کو قتل کیا، یا سولی دی، بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے مبغوض وملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیح علیہ السلام کے قتل کا واقعہ پیش آیا، نہ سولی کا، لیکن پال (PAUL) کے متبع نصاریٰ نے اِس فرضی افسانے کو لے کر اِس پر ایک پوری دیو مالا (MYTHOLOGY) تصنیف کر ڈالی اور اِس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔" (تدبر قرآن 2/420)

اِس دوسرے جملۂ معترضہ کو تہدید والے حصے کے سلسلۂ کلام کے اندر رکھ کر دیکھیں گے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ اِس کا تعلق اُس فہرستِ جرائم سے ہے، جس کے کچھ مندرجات اِس سے پہلے اور کچھ اِس کے بعد مذکور ہیں۔ آیت 159 سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ علما کی تاویل کو کلام قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، لہٰذا اُسے درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تاہم، بر سبیل تنزل اگر اِسے صحیح بھی ماننا چاہیں، تب بھی اِس کے اطلاق اور انطباق کی کوئی شکل متعین نہیں ہو سکتی۔ اِس کے نتیجے میں تعلیق بالمحال کی صورت پیدا ہوتی ہے اور آیت کے مندرجات مطابق حال اور ممکن الوقوع نہیں رہتے۔

دیکھیے، علما کا موقف یہ ہے کہ آیت کے الفاظ 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ' میں دونوں مفعولی ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اِس کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہو گا:

یہود و نصاریٰ میں سے ہر شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لازماً ایمان لائے گا۔ یعنی یہود و نصاریٰ کا ہر شخص مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد موت کا شکار ہو گا۔

اِس بیان کے اطلاق کے پانچ ممکنہ راستے ہیں:

1۔ اِس سے تاریخ انسانی کے تمام یہود و نصاریٰ مراد لیے جائیں۔ یعنی قیامت تک پیدا ہونے والے یہود و نصاریٰ حضرت مسیح کی وفات سے پہلے حضرت مسیح پر ایمان لے آئیں گے۔

یہ اطلاق خلافِ واقعہ ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ رفع مسیح کے بعد سے تاحال لاکھوں یہودی حضرت مسیح پر ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

2۔ اِس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ رسالت کے یہود و نصاریٰ مراد لیے جائیں۔

یہ اطلاق بھی خلافِ واقعہ ہے، کیونکہ اُس زمانے کے یہود رفع مسیح کے صدیوں بعد پیدا ہوئے اور اُن پر ایمان لائے بغیر وفات پا گئے۔

3۔ اِس سے حضرت مسیح کے اپنے زمانے کے یہود و نصاریٰ مراد لیے جائیں۔

یہ اطلاق بھی خلافِ واقعہ ہے، کیونکہ آپ کے مخاطب بنی اسرائیل ہی تو تھے، جو آپ کے قتل کے درپے تھے اور اُنھی سے حفاظت کے لیے اللہ نے آپ کے رفع کا اہتمام کیا تھا۔

4۔ نزولِ مسیح کے تصور کو یقینی مانتے ہوئے وہ یہود و نصاریٰ مراد لیے جائیں، جو نزول کے

موقع پر یا اُس کے بعد دنیا میں موجود ہوں گے۔

یہ اطلاق بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اِس کو اختیار کرنے کے لیے کلام کے اندر سے وہ قرینہ بتانا پڑے گا، جو ''اہل کتاب'' کے الفاظ کو زمانۂ نزولِ مسیح کے اہل کتاب کے ساتھ خاص کر دے۔

5۔ یہ سمجھا جائے کہ لفظ ''اہل کتاب'' بول کر صرف نصاریٰ کو مراد لیا گیا ہے۔

یہ اطلاق بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اول تو وہ پہلے ہی حضرت مسیح پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے یہ کہ آیت کے سیاق وسباق میں جو فردِ جرائم بیان ہوئی ہے، وہ یہود کے جرائم سے متعلق ہے۔

5۔ 'وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ' کا مصداق

سورۂ زخرف کے الفاظ 'وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ' (یقیناً وہ قیامت کی ایک بڑی دلیل ہیں) کو بھی بعض مفسرین نے نزولِ مسیح کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ نازل ہوں گے تو سب جان لیں گے کہ قیامت اب قریب آ گئی ہے۔ گویا یہاں وہی بات اجمالاً مذکور ہے، جو احادیث میں بالتفصیل روایت ہوئی ہے۔ اُن میں مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کا ذکر قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر ہوا ہے۔

یہ استدلال دو زاویوں سے درست نہیں ہے:

اولاً، یہاں سیدنا مسیح علیہ السلام کے اوصاف و احوال میں کسی خاص پہلو کو قیامت کی نشانی کے طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ اِس کے بجاے آپ کی ذاتِ اقدس کو بہ حیثیتِ مجموعی قیامت کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا بن باپ کے پیدا ہونا، گھوارے میں کلام کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، آسمان کی طرف اٹھایا جانا، آسمان سے نازل ہونا، سب غیر معمولی احوال ہیں، مگر اِن میں سے کسی کی تصریح آیت کے الفاظ میں نہیں ہے۔ سیاق و سباق میں بھی کسی خاص پہلو کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ چنانچہ اِس آیت کو نہ رفعِ مسیح کے لیے دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ نزولِ مسیح کے لیے۔

ثانیاً، آیت کا سیاق و سباق اِس امر کی تو پوری گنجایش دیتا ہے کہ یہاں سیدنا مسیح کے اُن

احوال کو مفہوماً مقدر سمجھا جائے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں معلوم و معروف تھے، مگر اُن احوال کو قبول کرنے میں مانع ہے، جن کی نوعیت پیشین گوئی کی ہے اور جنھیں زمانۂ مستقبل میں آشکار ہونا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس مقام کی آیات کے مخاطبین قریش کے لوگ ہیں۔ اُن کے سامنے اثباتِ قیامت کی کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، جس سے وہ تاریخی طور پر ناواقف ہوں یا جسے اُن کی موت کے بعد ظاہر ہونا ہو۔

کلام سے مخاطبین اور مخاطبت کی نوعیت پوری طرح واضح ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ. وَقَالُوْٓا ءَ اٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ. اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ. وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ. وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (43:57-62)

”اور جب (اِنھی حقائق کی یاددہانی کے لیے) ابن مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمھاری قوم کے لوگ اُس پر چیخنے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ (اُس کے پیرو بھی تو اُسے اپنا معبود سمجھتے ہیں، پھر) ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ وہ تمھارے سامنے یہ بات محض کج بحثی کے لیے اٹھاتے ہیں، بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ وہ ایک بندہ ہی تھا جس پر ہم نے اپنا فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے اُس کو (اپنی قدرت کی) ایک مثال بنایا اور (تمھیں کیا خبر کہ ہماری قدرت کس قدر بے پایاں ہے)؟ اگر ہم چاہتے ہوتے تو تمھارے اندر سے فرشتے پیدا کر دیتے جو زمین میں تمھاری جگہ آجاتے۔ (اِن سے کہو، اے پیغمبر کہ) یقیناً وہ قیامت کی

ایک بڑی دلیل ہے تو اُس کے برپا
ہونے میں شک نہ کرو اور میری
پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اور
شیطان تم کو (اِس راہ سے) روکنے نہ
پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمھارا کھلا
ہوادشمن ہے۔“

دیکھیے، اِس مقام کے آغاز میں 'وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ' (اور جب ابنِ مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمھاری قوم کے لوگ اُس پر چیخنے لگتے ہیں) کے الفاظ آئے ہیں۔ ”تمھاری قوم کے لوگ“ کے الفاظ سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین قریش مراد ہیں۔ پھر اختتامی حصے میں فرمایا ہے: 'اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ' (یقیناً وہ قیامت کی ایک بڑی دلیل ہے تو اُس کے برپا ہونے میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو)۔ یعنی قریش کے لوگو، مسیح ابنِ مریم کی ذات قیامت کی دلیل ہے، اُن کے احوال کے بارے میں جاننے کے بعد قیامت کے بارے میں تمام شکوک کو ختم کردو اور میری رسالت پر ایمان لے آؤ۔

کلام کی یہی نوعیت ہے کہ جس کے باعث سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے نزولِ مسیح کے قائل مفسر نے بھی اِس آیت سے حضرتِ مسیح کی آمدِ ثانی کے استدلال کو قبول نہیں کیا۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں اُنھوں نے لکھا ہے:

”اِس فقرے کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قیامت کے علم کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”وہ“ سے کیا چیز مراد ہے؟ حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر کے نزدیک اِس سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن سے آدمی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ قیامت آئے گی۔ لیکن یہ تفسیر سیاق وسباق سے بالکل غیر متعلق ہے۔ سلسلۂ کلام میں کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے، جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ دوسرے مفسرین

قریب قریب بالاتفاق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اِس سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم ہیں اور یہی سیاق و سباق کے لحاظ سے درست ہے۔ اِس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آں جناب کو قیامت کی نشانی یا قیامت کے علم کا ذریعہ کس معنی میں فرمایا گیا ہے؟ ابنِ عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی، ضحاک، ابو العالیہ اور ابو مالک کہتے ہیں کہ اِس سے مراد حضرت عیسیٰ کا نزولِ ثانی ہے، جس کی خبر بہ کثرت احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قیامت اب قریب ہے۔ لیکن اِن بزرگوں کی جلالتِ قدر کے باوجود یہ ماننا مشکل ہے کہ اِس آیت میں حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کو قیامت کی نشانی یا اُس کے علم کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ اِس لیے کہ بعد کی عبارت یہ معنی لینے میں مانع ہے۔ اُن کا دوبارہ آنا تو قیامت کے علم کا ذریعہ صرف اُن لوگوں کے لیے بن سکتا ہے، جو اُس زمانہ میں موجود ہوں یا اُس کے بعد پیدا ہوں۔ کفارِ مکہ کے لیے آخر وہ کیسے ذریعۂ علم قرار پا سکتا تھا کہ اُن کو خطاب کر کے یہ کہنا صحیح ہوتا کہ ”پس تم اِس میں شک نہ کرو“۔ لہٰذا ہمارے نزدیک صحیح تفسیر وہی ہے، جو بعض دوسرے مفسرین نے کی ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُن کے مٹی سے پرندہ بنانے اور مردے جِلانے کو قیامت کے امکان کی ایک دلیل قرار دیا گیا ہے، اور ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ جو خدا باپ کے بغیر بچہ پیدا کر سکتا ہے، اور جس خدا کا ایک بندہ مٹی کے پتلے میں جان ڈال سکتا اور مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، اُس کے لیے آخر تم اِس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں اور تمام انسانوں کو مرنے بعد دوبارہ زندہ کر دے؟“ (تفہیم القرآن 4/ 547-548)

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے ’وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ‘ کی تفسیر میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے قیامت کی دلیل ہونے کو دو پہلوؤں سے واضح کیا ہے:

ایک یہ کہ اللہ نے اُن کے ذریعے سے احیاے موتیٰ کے معجزے صادر کیے، جو قیامت اور بعث بعد الموت کے یقینی ہونے میں حتمی حجت کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب وہ مٹی سے پرندے کی مورت بنا کر اُس میں پھونک مارتے تھے تو وہ بے جان مورت جیتے جاگتے حقیقی پرندے میں بدل جاتی تھی۔ اِسی طرح وہ مرے ہوئے انسانوں کو اللہ کے حکم سے دوبارہ زندہ

کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت کے ذریعے سے یہود پر اپنی حجت تمام کی، جو اُن پر عذابِ الٰہی کے نزول کا موجب ہوئی۔[122] یہ قیامتِ صغریٰ آسمانی عدالت کا آغاز تھا، جس کی تکمیل 'السَّاعَۃ'، یعنی قیامتِ کبریٰ کی صورت میں ہونی تھی۔ استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

> "مسیح علیہ السلام بے باپ پیدا ہوئے اور اُن کو یہ حیرت انگیز معجزہ دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے اور مٹی سے پرندے کی مورت بنا کر اُس میں روح پھونک دیتے تھے۔ پھر وہی ہیں کہ جن کے ذریعے سے یہود کے لیے قیامت کے دن تک خدائی دینونت کا ظہور ہوا ہے۔ قرآن نے یہ اِسی بنا پر اُنھیں قیامت کی ایک بڑی دلیل قرار دیا ہے۔" (البیان 4/ 469)

---

122 سیدنا مسیح علیہ السلام کے ذریعے سے یہود پر ظاہر ہونے والی اللہ کی دینونت کی تفصیل اِس کتاب کے باب چہارم میں "نزولِ مسیح کی تمثیل کی تفہیم و تشریح" کے زیرِ عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

6۔ کیا نزولِ مسیح کا تصور ایمانیات میں شامل ہے؟

ہمارے علما نزولِ مسیح کے تصور کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک یہ توحید، رسالت اور آخرت جیسے عقائد ہی کی طرح ایک عقیدہ ہے، جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایمان رکھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تھے، قیامت کے قریب وہ آسمان سے براہِ راست نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کر کے اور دنیا پر اسلام کا غلبہ قائم کر کے وفات پا جائیں گے۔

جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع و نزول اور حیات و وفات کے اخبار اگر متحقق بھی ہوں تو اُنھیں علاماتِ قیامت یا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے طور پر بیان کرنا تو بجا ہے، اور اِس بنا پر اُنھیں ماننا آپ پر ایمان کا تقاضا بھی قرار دیا جا سکتا ہے، مگر عین عقیدہ و ایمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا کرنا دین کے عرف کے خلاف ہے۔

ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی بات کو پورے یقین قلب کے ساتھ مان لے۔ اِس کی اصل اللہ پر ایمان ہے، مگر اپنی تفصیل کے لحاظ سے یہ درج ذیل پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

1۔ اللہ پر ایمان، یعنی ہم بغیر کسی شائبۂ شرک کے اپنے آپ کو پورا کا پورا اپنے پروردگار کے حوالے کر دیں۔

2۔ فرشتوں پر ایمان، یعنی یہ مانیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک معصوم اور قدسی صفت

مخلوق ہیں، اُس کی ہدایت انسانوں کو پہنچاتے ہیں، اُس میں پوری طرح امین اور قابل اعتماد ہیں اور قضاو قدر کے فیصلے اُن کے ذریعے سے نافذ کیے جاتے ہیں۔

3۔ نبیوں پر ایمان، یعنی یہ تسلیم کرلیں کہ انبیا انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی ہیں، اُن کا علم بے خطا ہے، اُن کا عمل زندگی کے لیے اسوہ ہے اور اُن کی اطاعت، اتباع اور محبت ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

4۔ کتابوں پر ایمان، یعنی اِس بات پر ایمان لائیں کہ انبیا علیہم السلام جس چیز کو کتاب الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے۔ اللہ نے اُسے حق و باطل کے لیے کسوٹی بنا کر نازل کیا ہے، اور اِس لیے نازل کیا ہے کہ دین کے معاملے میں لوگ ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

5۔ روزِ جزا پر ایمان، یعنی اِس بات کو تسلیم کریں کہ مرنے کے بعد ہم لازماً اٹھائے جائیں گے، ایمان و عمل صالح کے سوا وہاں کوئی چیز اُن کے کام نہ آئے گی، اپنے ہر قول و فعل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور اذنِ خداوندی کے بغیر وہاں کسی کو یارا نہ ہو گا کہ اُن کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ دے۔[123]

ارشاد فرمایا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ٭۫ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ.
(البقرہ2:285)

”ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر

---

[123] ماخوذ از ”البیان“ 1/178-181۔

ایمان لائے۔(اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ ہی کی ایک فرع —— تقدیر کے خیر و شر —— کو اِن میں شامل کر کے اِنھیں اِس طرح بیان فرمایا ہے:

الإيمان أن تؤمن بالله، وملئكته، وكتبه، ورسله، واليوم الآخر، و تؤمن بالقدر خيره وشره. (مسلم، رقم 102)

"ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو مانو اور اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں کو مانو، اور آخرت کے دن کو مانو، اور اپنے پروردگار کی طرف سے تقدیر کے خیر و شر کو بھی۔"[124]

اِس سے واضح ہے کہ دین میں جن چیزوں کو ایمان و عقیدے کا درجہ حاصل ہے، وہ یہی پانچ ہیں۔ اِن کے علاوہ دیگر اجزاے دین کو ایمانیات کے زیرِ عنوان بیان کرنا درست نہیں ہے۔ جب اللہ اور اللہ کے رسول نے ایمانیات کے موضوعات کی تعیین کر دی ہے تو ہمیں اِس میں ترمیم و اضافے کا کوئی حق نہیں ہے۔

لہٰذا مثال کے طور پر ہم نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج و عمرہ اور قربانی کو عبادات کے زمرے میں شامل کریں گے؛ جہاد اور حدود و تعزیرات کے لیے قانون اور شریعت کی تعبیرات اختیار

---

[124] ماخوذ از "میزان" 76۔

کریں گے؛ عاد و ثمود کی ہلاکت، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات کو اخبارِ ماضیہ قرار دیں گے؛ فتح مکہ اور رومیوں کی فتح کو پیشین گوئیاں کہیں گے اور یاجوج وماجوج کے خروج کو علاماتِ قیامت کے زیرِ عنوان بیان کریں گے۔ یہ سب حقائق ہیں، اِن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت شبہے سے پاک ہے۔ ہم اِنھیں تسلیم کریں گے اور اِن کے انکار کو ایمان کے منافی قرار دیں گے، مگر اِن کے لیے ایمانیات کی تعبیر اختیار نہیں کریں گے۔

اِس بات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کے وہ مندرجات جو محل تدبر ہیں اور جن کے بارے میں تاویل یا تعبیر کا اختلاف ممکن ہے، اُنھیں ایمانیات کے زمرے میں شامل کرنے سے علمی لحاظ سے دو مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک زاویے سے دیکھا جائے تو ایمانیات کا دائرہ محل بحث میں آجاتا ہے۔ ایمانیات دین کی اساسات ہیں اور اِن پر بحث و نظر اور اختلاف کی گنجایش تسلیم کرنا دین کی بنیادوں کو مقام نزاع میں لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اگر اخبار و اطلاعات کی اختلافی چیزوں کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کیا جائے گا تو گویا ایمانیات کے اصل مباحث پر بحث و نزاع کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ختم نبوت کا تصور ایمان بالرسالت کا حصہ ہے۔ اِس پر بلا چون و چرا ایمان لانا ضروری ہے۔ اِس سے انحراف ایمان سے انحراف ہے۔ ایمان پر قائم رہتے ہوئے اِس پر بحث و نزاع کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن اگر مثال کے طور پر علاماتِ قیامت —— لونڈی کے اپنی مالکہ کو جننے، عربوں کا عمارتیں بنانے میں مقابلہ کرنے، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، زمین سے کسی خاص جانور کے پیدا ہونے —— جیسے قابل تاویل اخبار کو ایمانیات کی فہرست میں شامل کیا جائے گا تو اِن کے ساتھ نبوت اور ختم نبوت جیسے اصل ایمانیات کو بھی قابل تاویل سمجھا جانے لگے گا۔

اِس کے برعکس، اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اخبار و اطلاعات کی نوعیت کی چیزوں کو ایمان کا درجہ دینے سے اُن کے بارے میں غور و فکر اور اختلاف رائے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ گویا اگر کوئی محدث یا مفسر اُنھیں قبول نہیں کرے گا یا اُن کی مختلف تاویل کرے

گا تو اُس کے عقیدہ و ایمان پر سوال کھڑا ہو جائے گا۔

اِس بات کو چند مثالوں سے سمجھ لیجیے۔ یہ سوال کہ قرآن میں 'غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ' کا مصداق کون لوگ ہیں یا یہ سوال کہ جس 'شجرۃ' سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، اُس سے کون سا درخت مراد ہے، بحث و تمحیص کا موضوع بن سکتا ہے۔ اِس نوعیت کے مباحث علمی مباحث ہیں، جن کے فہم میں علما کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے اور اکثر ہوا بھی ہے۔ ذوالقرنین اور حضرت خضر کے اخبار کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ذوالقرنین کے معنی ہیں: دو سینگوں والا، مگر اِس کا مصداق کون سی شخصیت ہے، اِس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ چنانچہ بعض علما اُسے اسکندرِ اعظم سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک یہ یمن کا ایک بادشاہ تھا اور بعض اِسے ایرانی بادشاہ خسرو قرار دیتے ہیں۔ حضرت خضر کے حوالے سے بھی تین آرا نمایاں ہیں: ایک کے مطابق وہ فرشتہ تھے، دوسری کے مطابق پیغمبر تھے اور تیسری کے مطابق ولی تھے۔ اِس نوعیت کا علمی اختلاف، ظاہر ہے کہ ایمانیات کو متاثر نہیں کرتا، لیکن اگر ہم اِس طرح کے اخبار کو من جملۂ ایمانیات قرار دیں گے تو پھر بہ صورتِ اول اِن پر بحث کا دروازہ بند ہو جائے گا اور بہ صورتِ ثانی اختلاف کرنے والے مفسرین اور شارحین کے بارے میں ایمانیات کے انکار کا الزام قائم ہو جائے گا۔ اِس کے نتیجے میں یہ سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے کہ اصحاب علم کی طرف سے ایمانیات کے زیرِ عنوان الگ الگ فہرستیں جاری ہونا شروع ہو جائیں اور مسلمہ اور متفق علیہ ایمانیات کا مقام و مرتبہ مجروح ہونا شروع ہو جائے۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ایمانیات کو اِس طرح کی بحث و نزاع سے مستقل طور پر بالاتر رکھا جائے۔

خلاصۂ مباحث

نزولِ مسیح کا تصور

ہماری علمی روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے تصور کو ''نزولِ مسیح'' کے زیرِ عنوان بیان کیا جاتا ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ آپ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت کے قریب زمین پر براہِ راست نازل ہوں گے۔

علما کا استدلال

اِس تصور کے لیے قرآنِ مجید اور احادیثِ نبوی، دونوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ استدلال کے بنیادی نکات یہ ہیں:

1۔ آلِ عمران (3) کی آیات 54-55 سے اخذ کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھالیا تھا، لہٰذا تاحال آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ اِس کی دلیل 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ'، ''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا۔'' کے الفاظ ہیں۔ 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' (میں تجھے وفات دوں گا) میں وفات کا مطلب موت دینا نہیں، بلکہ تحویل میں لینا ہے اور 'رَافِعُكَ اِلَيَّ' (میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا) میں ضمیرِ مخاطب سے مراد مسیح

علیہ السلام کا پورا وجود ہے، جو روح و بدن، دونوں کو شامل ہے۔

2۔ سورۂ نساء (4) کی آیت 159 کے الفاظ 'وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'، ''اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا، جو اُس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اُس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان نہ لائے گا'' سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے پاس زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے زمین پر نازل ہوں گے، کیونکہ آپ کے نزول کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اہل کتاب کا ہر شخص آپ پر ایمان لے آئے۔

3۔ نزولِ مسیح کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ اِس موضوع کی روایتیں صحیح اور حسن اسناد کے ساتھ حدیث کی بیش تر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ اُن میں بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرشتوں کے ہم راہ دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر اتریں گے اور مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کریں گے۔ پھر وہ دجال اور اُس کے یہودی لشکریوں کو قتل کر دیں گے۔ اُن کی دعا سے یاجوج و ماجوج بھی فنا ہو جائیں گے۔ دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی اور کرۂ ارض پر اسلام کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہے گا۔ وہ چالیس سال تک دنیا پر امام عادل کی حیثیت سے حکمرانی کریں گے۔ اِس کے بعد وفات پا جائیں گے۔ مسلمان آپ کا جنازہ پڑھیں گے اور آپ کی تدفین کریں گے۔ آپ کی وفات کے بعد جلد ہی قیامت برپا ہو جائے گی۔

نزولِ مسیح کے تصور پر غامدی صاحب کے اشکالات

جناب جاوید احمد غامدی نزولِ مسیح کے تصور کو محل نظر سمجھتے ہیں۔ اِس کا سبب وہ اشکالات ہیں، جو نزولِ مسیح کے تصور کو قرآنِ مجید کی روشنی میں دیکھنے اور اُس کی احادیث کو روایت و درایت کے اصولوں پر پرکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اشکالات درجِ ذیل ہیں:

1۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ مجید میں کئی پہلوؤں سے زیرِ بحث آئی ہے۔ اُن کی دعوت اور شخصیت پر قرآن نے جگہ جگہ تبصرہ کیا ہے۔ روزِ قیامت کی ہلچل بھی قرآن

کا خاص موضوع ہے۔ ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اِس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم و عقل اِس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اِسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔

2۔ سورۂ مائدہ (5) کی آیات 116-119 میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے، جو قیامت کے دن ہو گا۔ اُس میں اللہ تعالیٰ اُن سے نصاریٰ کی اصل گم راہی کے بارے میں پوچھیں گے کہ کیا تم نے یہ تعلیم اِنھیں دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ اِس کے جواب میں وہ دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ میں نے تو اِن سے وہی بات کہی، جس کا آپ نے حکم دیا تھا اور جب تک میں اِن کے اندر موجود رہا، اُس وقت تک دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو میں نہیں جانتا کہ اِنھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ہے۔ اِس کے بعد تو آپ ہی اِن کے نگران رہے ہیں۔ اِس میں دیکھ لیجیے، مسیح علیہ السلام اگر ایک مرتبہ پھر دنیا میں آچکے ہیں تو یہ آخری جملہ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اِس کے بعد تو اُنھیں کہنا چاہیے کہ میں اِن کی گم راہی کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ابھی کچھ دیر پہلے اِنھیں اُس پر متنبہ کر کے آیا ہوں۔

3۔ آلِ عمران (3) کی آیت 55 میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحۂ عمل بیان فرمایا ہے۔ یہ موقع تھا کہ قیامت تک کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بیان کر رہے تھے، جو اُن کے اور اُن کے پیرووں کے ساتھ ہونے والی ہیں تو یہ بھی بیان کر دیتے کہ قیامت سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تجھے دنیا میں بھیجنے والا ہوں، مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ سیدنا مسیح کو آنا ہے تو یہ خاموشی کیوں ہے؟ اِس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

4۔ حدیث کی دستیاب کتابوں میں سے اولین کتاب ”صحیفہ ہمام ابن منبہ“ ہے، جو 58ھ

سے کچھ پہلے مرتب ہوا۔ اِس میں نزولِ مسیح کی روایت شامل نہیں ہے۔ اِس میں کل 138 احادیث شامل ہیں۔ یہ تمام حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات ہیں، جو نزولِ مسیح کی روایات کے نمایاں راوی ہیں۔ حیران کن بات ہے کہ اُنھوں نے اپنے براہِ راست شاگرد ہمام بن منبہ کو جب روایات املا کرائیں تو اُن میں نزولِ مسیح کی روایت کو شامل نہیں کیا، جب کہ وہ اِسے دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں۔ اِس پر مستزاد یہ ہے کہ مذکورہ صحیفے میں مسیح علیہ السلام اور دجال سے متعلق بعض دیگر روایات نقل ہوئی ہیں، مگر نزولِ مسیح اور دجال کے قتل کی زیادہ اہم روایت نقل نہیں ہوئی۔ اِسی طرح اِس میں قربِ قیامت کی نشانیوں کی پانچ روایتیں نقل ہوئی ہیں، مگر اُن میں اہم ترین علامت نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے۔

5۔ موطا احادیث کا پہلا باقاعدہ مجموعہ ہے۔ اِس میں بھی نزولِ مسیح کی روایت شامل نہیں ہے۔ اِسے امام مالک نے 40 سالہ محنت کے بعد 140ھ میں مکمل کیا۔ احادیث کے باقی مجموعے اِس کے کم و بیش سو سال بعد تالیف ہوئے۔ امام نے اِسے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھ کر تالیف کیا۔ وہ اِس کی تالیف کے بعد کم و بیش چالیس سال تک حیات رہے، اِس کا درس دیتے رہے اور اِس پر نظر ثانی کرتے رہے۔ کوئی کتاب 40 سال کے طویل عرصے میں ترتیب پائے اور پھر برسوں تک مصنف کی نظر ثانی سے بھی گزرے، اُس کا زمانۂ تالیف حدیث کے اصل راویوں، یعنی صحابۂ کرام سے بالکل قریب ہو اور اُسے اسلام کے عین مرکز میں تالیف کیا گیا ہو، اِس کے بعد نزولِ مسیح جیسی غیر معمولی روایت اگر مصنف تک نہیں پہنچی تو یہ امر بھی باعثِ اشکال ہے اور اگر پہنچی ہے اور اُنھوں نے اِسے قبول نہیں کیا تو یہ بھی اشکال کا باعث ہے۔ مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اِس میں عیسیٰ علیہ السلام اور دجال سے متعلق باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ اِس کا عنوان ہے: 'باب صفة عيسىٰ بن مريم والدجال'، یعنی عیسیٰ ابنِ مریم اور دجال کے احوال کا باب۔ اِس کے تحت اُنھوں نے ایک ہی روایت نقل کی ہے۔ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رؤیا بیان ہوا ہے، جس میں آپ نے حضرت مسیح اور دجال کو دیکھا ہے۔

6۔ نزولِ مسیح کی مرفوع احادیث کی تعداد 80 سے زائد ہے، جو کم و بیش 30 صحابۂ کرام سے روایت ہوئی ہیں۔ امام بخاری نے اِن میں سے صرف تین مختصر روایتوں کا انتخاب کیا ہے، جو ایک ہی صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اِن تین روایتوں میں سے دو کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ایک ہی روایت کے دو مختلف طریق ہیں۔ اِن روایتوں میں بنیادی راوی ابنِ شہاب زہری ہیں۔ یعنی اُنھوں نے اِس ضمن میں امام زہری ہی کی روایتوں کا اعتبار کیا ہے۔ امام بخاری کا یہ طرزِ عمل نزولِ مسیح کی جملہ روایتوں کے بارے میں اُن کے تردد کو نمایاں کرتا ہے۔

7۔ مسلم، رقم 7460 میں نزولِ مسیح کا واقعہ نہایت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام عین اُس موقع پر نازل ہوں گے، جس وقت مسلمانوں کی فوج قسطنطنیہ کو فتح کر لینے کے بعد دجال کے ظہور کی خبر سن کر مدینہ کی طرف واپس پلٹے گی۔ اب حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ 29 / مئی 1453ء بہ مطابق 20 / جمادی الاول 857ھ کو قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے۔ اُس کے بعد تا حال وہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے، بلکہ استنبول کے نام سے اسلامی ملک ترکیہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلم کی حدیث نے حضرت مسیح کے نزول کا جو وقت متعین کیا ہے، وہ قسطنطنیہ کی فتح کے متصل بعد ہے۔ یہ وقت جون / جولائی 1453ء میں گزر چکا ہے۔ قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے، مگر نہ دجال ظاہر ہوا ہے اور نہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوئے ہیں۔ اِس کے بعد بیانِ واقعہ کی دو باتوں میں سے ایک بات کو صحیح ماننا ہو گا اور دوسری کو راوی کی غلطی یا اضافے پر محمول کرنا ہو گا: یا یہ ماننا ہو گا کہ روایت میں نزولِ مسیح کی بات تو درست ہے، مگر قسطنطنیہ کی فتح اور اُس کے فاتح لشکر کا ذکر اضافی ہے یا یہ ماننا ہو گا کہ روایت میں قسطنطنیہ کی فتح اور اُس کے فاتح لشکر کا ذکر تو درست ہے، مگر نزولِ مسیح کی بات اضافی ہے۔ اِن دونوں واقعات کے وقوع کو بہ یک وقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اِن باہم متصل واقعات میں سے ایک واقعہ 570 سال پہلے رونما ہو چکا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اِن دونوں واقعات میں سے ایک کو قبول کرنے اور دوسرے کو قبول نہ کرنے کی صورت

میں پورا بیانِ واقعہ ہی محل اشتباہ میں آ جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی اگر صحیح نقل ہو گئی ہے تو اُس میں ادنیٰ درجے میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ آپ کی بات کاتبِ تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اُسی طرح رونما ہوتا ہے، جیسا کہ اُس کے پیغمبر کی زبانِ فیض ترجمان سے صادر ہوا ہے۔ یہاں واضح رہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ پر لشکر کشی کرنے والے مسلمانوں کو جنت کی بشارت دی ہے۔

ہمارے علما نے اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مذکورہ دو امکانات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے یا روایت پر توقف کرنے کے بجائے اِس کی ایک تاویل پیش کی ہے۔ اِس تاویل کے مطابق 1453ء میں واقع ہونے والی قسطنطنیہ کی فتح وہ فتح نہیں ہے، جس کا ذکر روایت میں ہوا ہے۔ اُن کے نزدیک فتح قسطنطنیہ کا واقعہ ایک مرتبہ پھر رونما ہو گا۔ اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ معاملات پیش آئیں گے، جن کا ذکر مذکورہ روایت میں ہوا ہے۔

اِس تاویل پر چند عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ قسطنطنیہ کا جو غیر معمولی تاریخی پس منظر ہے اور جیسے مسلمانوں نے اُس کو فتح کرنے کے لیے صدیوں تک مسلسل جدوجہد کی ہے اور جس طرح اُنھوں نے اِس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی اور بشارت کو مدِ نظر رکھا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ اگر دوبارہ بھی مفتوح ہوتا ہے تو یہ دوسری فتح پہلی فتح جتنی غیر معمولی اور عظیم الشان نہیں ہو سکتی۔ دوم یہ کہ علما کی اِس تاویل کو ماننے کے لیے تہذیب و تمدن کے پہیے کو ماضی کی طرف پھیرنا ہو گا۔ یعنی یہ فرض کرنا پڑے گا کہ وہ زمانہ واپس آئے گا، جب جنگیں بارودی، ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ کے بجائے نیزوں اور تلواروں سے لڑی جائیں گی۔ جدید طرز کی باقاعدہ فوج رکھنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، جس میں سپاہی ریاست کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں۔ اِس کے بجائے پرانا طریقہ واپس آ جائے گا، جب فتح کے بعد سپاہیوں میں مالِ غنیمت تقسیم کیا جاتا تھا۔ سوم یہ کہ یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ترکیہ کا شہر استنبول (قسطنطنیہ) دوبارہ رومیوں کے قبضے میں جائے گا اور

اُسے دنیا میں وہی غیر معمولی مذہبی اور سیاسی مقام حاصل ہو گا، جو پندرھویں صدی عیسوی میں یا اُس سے پہلے حاصل تھا۔ چہارم یہ کہ اِس تاویل کو ماننے کی صورت میں مذکورہ روایت یا مجموعۂ روایات کا پیشین گوئی ہونے کا مرتبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پیش گوئی اُسی صورت میں پیش گوئی قرار پاتی ہے، جب وہ مستقبل کے بارے میں متعین اور موقت خبر سے آگاہ کرے۔ چنانچہ اگر قسطنطنیہ کی فتح کا مصداق ہی متعین نہیں ہے —— یعنی یہ طے ہی نہیں ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کو کتنی بار فتح کریں گے اور وہ کون سی فتح ہو گی، جس کے بعد نزولِ مسیح ہو گا —— تو پھر اِس روایت کو کیسے پیشین گوئی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ پنجم یہ کہ اگر روایت کے ایک واقعے، یعنی قسطنطنیہ کی فتح کا مفہوم و مصداق مبہم ہے تو پھر دیگر واقعات، یعنی نزولِ مسیح اور دجال کے خروج کے مفہوم و مصداق کو کیسے ابہام سے پاک قرار دیا جا سکتا ہے؟

8۔ روایتوں سے واضح ہے کہ نزولِ مسیح کا واقعہ قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ وہ روایتیں جن میں قرب قیامت کی علامتیں بیان ہوئی ہیں، اُن میں سے بعض ایسی ہیں، جن میں اِن علامتوں کو گن کر بتایا گیا ہے۔ اِن میں سے بعض تین، بعض چار، بعض چھ اور بعض دس علامتوں کو بیان کرتی ہیں۔ اِن سب کو جمع کیا جائے تو مجموعی طور پر پندرہ بیس علامتیں سامنے آتی ہیں: نزولِ مسیح، دجال، یاجوج و ماجوج، دھواں، زمین کا جانور، سورج کا مغرب سے طلوع، مشرق میں زمین کا دھنس جانا، مغرب میں زمین کا دھنس جانا، جزیرہ نمائے عرب میں زمین کا دھنس جانا، لونڈی کا اپنی مالکہ کو جننا، آگ جو یمن سے نکل کر لوگوں کو ہانکے گی، ہوا جو لوگوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی، موت، 30 دجالوں کا خروج، عیسائی رومیوں کی اکثریت، بلند عمارتیں بنانے میں مسابقت وغیرہ۔ اِن میں سب سے غیر معمولی علامت نزولِ مسیح کی ہے۔ باقی علامتوں کے مقابل میں یہ سب سے نمایاں بھی ہے، نہایت درجہ خارقِ عادت بھی ہے اور اِس کا مفہوم و مصداق بھی پوری طرح واضح ہے۔ اِس بنا پر فطری تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی روایت میں قربِ قیامت کی علامتوں کو گنوایا گیا ہو تو اُن میں نزولِ مسیح کی علامت کو ضرور شامل ہونا چاہیے۔ یہ انسانی عقل اور تجربے کے خلاف

ہے کہ سب سے نمایاں بات چھوڑ کر مقابلتاً کم اہم باتیں بیان کر دی جائیں۔ اب حقیقت یہ ہے کہ علاماتِ قیامت کی متعدد روایات میں نزولِ مسیح کی علامت کو بیان نہیں کیا گیا۔ مسلم کی ایک روایت، رقم 7584 میں قیامت کی چھ علامات بیان ہوئی ہیں، مگر اُن میں نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے۔ اِسی طرح بخاری کی روایت، رقم 7121 میں قیامت کی 11 علامتیں بیان ہوئی ہیں اور اِن میں دجال کی علامت بھی شامل ہے، مگر نزول مسیح کی علامت شامل نہیں ہے۔ ترمذی، رقم 3072 کی روایت میں 3 علامتیں مذکور ہیں، مگر اِن میں نزولِ مسیح کی علامت بیان نہیں ہوئی۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت، رقم 23996 میں قیامت کی چھ نشانیاں بیان ہوئی ہیں، مگر اُن میں نزولِ مسیح کا ذکر نہیں ہے۔ اِس طرح کی اور مثالیں بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

9۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں تضاد اور تناقض نہیں ہو سکتا۔ دین کے حوالے سے آپ جو بات بھی ارشاد فرماتے ہیں، وہ من جانبِ اللہ ہوتی ہے، اِس لیے سہو و نسیان اور تعارض و تناقض سے پاک ہوتی ہے۔ یہ حقیقتِ واقعہ بھی ہے اور اصولِ حدیث کا مسلمہ بھی ہے۔ چنانچہ اِس طرح کی کوئی صورت سامنے آجائے تو ہماری علمی روایت میں دو متضاد روایتوں میں سے اُس روایت کو ترجیح دی جاتی ہے، جو قرآن و سنت اور علم و عقل کی روشنی میں لائق ترجیح ہو۔ یہ ترجیح اگر ممکن نہ ہو تو حالات، زمانے اور مخاطبین کی رعایت سے توجیہ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اِس میں بھی اگر دشواری ہو تو دونوں کے بارے میں توقف کیا جاتا ہے اور اُن سے استدلال اور احتجاج سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ نزولِ مسیح کی روایتوں میں داخلی اور خارجی، دونوں پہلوؤں سے بعض ایسی چیزیں نقل ہوئی ہیں، جن سے تعارض اور تناقض کی صورت سامنے آتی ہے۔ اِن میں سے ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ نزول مسیح کی روایتوں کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام دنیا بھر سے عیسائیوں اور یہودیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ قیامت اُس وقت واقع ہو گی، جب دنیا میں صرف مسلمان ہی باقی رہ جائیں گے،

عیسائیوں کا کوئی وجود نہ ہو گا۔ اب مسلم کی روایت، رقم 2898 اِس سے مختلف خبر دیتی ہے۔ اِس کے مطابق قیامت اُس وقت واقع ہو گی، جب دنیا میں عیسائیوں کی اکثریت ہو گی۔

اشکالات کے نتیجے میں غامدی صاحب کا موقف

جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک یہ اشکالات مانع ہیں کہ روایات میں منقول نزولِ مسیح اور اُس کے متعلقات کو متعین، محسوس اور مشہود واقعات کے طور پر قبول کیا جائے۔ اِن کے ساتھ یہ جائز نہیں ہے کہ مذکورہ تصور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے پیش کیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ اقدس سے کسی ناقابلِ اطمینان اور مشتبہ بات کو منسوب کرنا دین وایمان کے منافی ہے۔

اِس کے بعد اب سوال یہ ہے کہ اگر غامدی صاحب نزولِ مسیح کے معروف تصور کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو درست نہیں سمجھتے تو کیا وہ اِس موضوع کی کثیر روایات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں؟ اِس کا جواب نفی میں ہے۔ غامدی صاحب اِس موضوع کی جملہ روایات کو اصلاً قبول کرتے ہیں، تاہم وہ اُن کی تاویل سنن ابنِ ماجہ میں رقم 4081 کے تحت نقل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اِس روایت سے واضح ہے کہ نزولِ مسیح اور قتل دجال کا ذکر خود مسیح علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معراج کے موقع پر کیا تھا۔ روایت کے مطابق اسرا و معراج کے رؤیا میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انبیا علیہم السلام سے ملاقات فرمائی تو وقوعِ قیامت کا موضوع بھی زیرِ بحث آیا۔ اُس موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ وہ قیامت سے پہلے اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔

استاذِ گرامی کے نزدیک اِس روایت میں 'فأنزل فأقتله' (میں اتروں گا اور اُسے قتل کروں گا) کے الفاظ کو اُن کے ظاہری معنی پر محمول کر کے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ مسیح علیہ

السلام بہ نفس نفیس آسمان سے اتریں گے۔ اِس کے دو بنیادی وجوہ ہیں:

اولاً، قرآنِ مجید اِس امر کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

ثانیاً، روایتوں میں مذکور نزولِ مسیح کا متعین وقت گزر چکا ہے اور نزولِ مسیح کا واقعہ رونما نہیں ہوا ہے۔ یہ مقرر وقت 857 ہجری بہ مطابق 1453 عیسوی ہے، جو 570 سال پہلے گزر چکا ہے۔ اگر نزولِ مسیح کے الفاظ سے آپ کا شخصی نزول مراد ہوتا تو لازم تھا کہ اُس موقع پر دجال بھی ظاہر ہوتا اور آپ نازل ہو کر اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ مگر تاریخ کی شہادت اِس کے برخلاف ہے۔

اِس کے بعد نزولِ مسیح کو قبول کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اِسے تمثیل مان کر اِس کی مجازی تعبیر قیاس کی جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کو جو حقائق رؤیاے صادقہ کے طریقے پر مشاہدہ کرائے جاتے ہیں، وہ بعض اوقات رؤیت کے عین مطابق اور بعض اوقات محتاجِ تعبیر ہوتے ہیں۔ مستقبل کے حالات و وقائع کے بارے میں بالعموم عالم رؤیا میں تمثیل و تشبیہ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات مثالوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ گویا مثال کی تجسیم ہو جاتی ہے اور وہ کبھی واقعہ کی صورت میں ممثل ہو کر سامنے آتی ہے اور کبھی واقعے کی روداد کے طور پر لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں واقعے اور مثال کا باہمی تعلق تشبیہ کا ہوتا ہے۔

اِس نوعیت کے جو رؤیا قرآن و حدیث میں نقل ہوئے ہیں، اِن میں سے بعض کے تعبیری مصداقات خود قرآن میں بیان ہو گئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں۔ اِس کی تعبیر، ظاہر ہے کہ یہ تھی کہ وہ اپنے فرزند کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ کی نذر کر دیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے رؤیا میں سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس کی تعبیر یہ نہیں تھی کہ یہ اجرامِ فلکی آپ کے سامنے سجدہ ریز ہوں، بلکہ یہ تھی کہ آپ کے

والدین اور گیارہ بھائی احتراماً آپ کے آگے جھک جائیں گے۔

اِس استدلال کی بنا پر استاذِ گرامی نے نزولِ مسیح کے بیان کو تمثیل قرار دیا ہے اور قرآنِ مجید، بائیبل اور احادیث کے نظائر کی روشنی میں اِس کے مصداق کی تعیین کی ہے۔ چنانچہ اُن کا موقف ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے نازل ہونے سے آپ کا شخصی نزول نہیں، بلکہ مجازی نزول مراد ہے۔ یعنی جب مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اتروں گا تو اِس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ بہ نفس نفیس دوبارہ نازل ہوں گے، بلکہ یہ تھا کہ آپ کی ہدایت —— جسے نصاریٰ نے یک سر زائل کر دیا ہے —— دوبارہ ظاہر ہو گی۔

اُن کے نزدیک یہ بالکل ویسی ہی تمثیل ہے، جیسی مسیح علیہ السلام نے اپنی عدالت کے بارے میں بیان فرمائی تھی۔ انجیل متی سے واضح ہے کہ اُنھوں نے بہ حیثیتِ رسول اپنی عدالت کے برپا ہونے کو بھی اپنی آمد سے تعبیر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ”جیسا نوح کے دنوں میں ہوا، ویسا ہی اِبنِ آدم (مسیح علیہ السلام) کے (دوبارہ) آنے کے وقت ہو گا۔ کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے کے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے، اُس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا۔ اور جب تک طوفان آکر اُن سب کو بہا نہ لے گیا، اُن کو خبر نہ ہوئی۔ اُسی طرح اِبنِ آدم کا آنا ہو گا۔“ (متی 24:37-39)

اِس سے واضح ہے کہ نزولِ مسیح کے باب میں استاذِ گرامی کا موقف حدیث کے الفاظ اور اُن کے مصداق کا انجیل کے الفاظ اور اُن کے مصداق پر قیاس ہے۔ یعنی اُنھوں نے حدیث میں نقل ”میں (عیسیٰ ابنِ مریم) نازل ہوں گا“ کے الفاظ کو انجیل میں نقل ”ابنِ آدم (عیسیٰ ابنِ مریم) آئے گا“ کے الفاظ پر قیاس کیا ہے اور اِس کے مصداق کو بالکل اُسی طرح آپ کی مجازی آمد پر محمول کیا ہے، جیسے انجیل کی پیش گوئی کا مجازی مصداق تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔ گویا جس طرح وہاں آپ کے آنے سے آپ کی ”عدالت کا آنا“ مراد ہے، اُسی طرح یہاں آپ کے آنے سے آپ کی ”ہدایت کا آنا“ مراد ہے۔

اِس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیدنا مسیح کی ہدایت دو ہزار سال پہلے آچکی ہے تو اب

دوبارہ ہدایت آنے کی کیا نوعیت ہے اور اُس کی ضرورت کس بنا پر ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس سے مراد آپ کی ہدایت کی تجدید اور اُس کا احیا ہے۔ گویا یہ آپ کی ہدایت کا ظہورِ ثانی ہے۔ اِس کا وقوع اِس لیے ضروری ہے کہ آپ کی اصل ہدایت آپ کے متبعین کے فکر و عمل سے بالکل محو ہو گئی ہے۔ اُس کی جگہ ایسا مذہب اپنا لیا گیا ہے، جو آپ کی ہدایت کے بالکل برعکس ہے۔ اِس طرح کا غیر معمولی حادثہ کسی اور پیغمبر کی ہدایت کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اِس حادثے کے تین پہلو غیر معمولی ہیں: ایک یہ کہ مسیح علیہ السلام کی ہدایت توحید کی اساس سے محروم کر دی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی تصدیق شدہ شریعت کو یک سر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر سب انسانوں کے جرائم کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

اِس تناظر میں غامدی صاحب کا قیاس یہ ہے کہ قیامت سے پہلے مسیح علیہ السلام کی ہدایت اپنی اصل صورت میں بحال ہو جائے گی۔ اِس کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ نصاریٰ میں تجدید و احیاے دین کی تحریک اٹھے گی، جو سینٹ پال کے وضع کردہ دین کو ختم کر کے مسیح علیہ السلام کے اصل دین کو از سرِ نو قائم کر دے گی۔ یہ گویا آپ کی دعوت و ہدایت کا ظہورِ ثانی ہو گا۔ اس کے نتیجے میں صلیب توڑ دی جائے گی۔ یعنی اُس کو اُس کے تمام تصورات سمیت پاش پاش کر دیا جائے گا۔ خنزیر کو قتل کر دیا جائے گا۔ گویا وہ شریعت بحال ہو جائے گی، جس میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں اور نصاریٰ میں مخاصمت ختم ہو جائے گی۔ یعنی جب نصاریٰ اصل ہدایت پر واپس آ جائیں گے اور تثلیث کے عقیدے سے تائب ہو کر توحید کو اختیار کر لیں گے تو اُن کے اور مسلمانوں کے مابین جنگ و جدل کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔

'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ' کی تفسیر میں غامدی صاحب کا موقف

آلِ عمران (3) کی آیت 55 کے الفاظ 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ'، ''میں نے فیصلہ کیا ہے

کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا“ سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھالیا تھا، لہٰذا تاحال آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے، بلکہ آپ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ ’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ‘ (میں تجھے وفات دوں گا) میں وفات کا مطلب موت دینا نہیں، بلکہ تحویل میں لینا ہے اور ’رَافِعُكَ اِلَیَّ‘ (میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا) میں ضمیرِ مخاطب سے مراد مسیح علیہ السلام کا پورا وجود ہے، جو روح و بدن، دونوں کو شامل ہے۔

جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک ’توفی‘ یہاں صریح طور پر وفات کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اِسے پورا لے لینے کے معنی پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ اُن کے دلائل درج ذیل ہیں۔

اولاً، زبان کا مسلمہ ہے کہ الفاظ و اسالیب کے مفہوم کا تعین اُن کے معروف اور مستعمل معنی سے ہوتا ہے۔ اِسی طرح اِس امر کا فیصلہ بھی عرفِ عام سے ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے یا مجازی معنی میں آیا ہے۔ چنانچہ ’توفی‘ کے معنی کا تعین لغت میں اِس کے مختلف معنی دیکھ کر نہیں، بلکہ جملے میں اِس کا استعمال دیکھ کر کیا جائے گا۔ اُس استعمال کے بارے میں زبان کا عرف جو فیصلہ کرے گا، اُسی کو قبول کیا جائے گا۔

ثانیاً، یہ بھی زبان کا مسلمہ ہے کہ کسی جملے میں استعمال ہونے والے فعل کا مفہوم مجرد اُس فعل کی بنا پر طے نہیں ہوتا، بلکہ اُن نسبتوں کی بنا پر طے ہوتا ہے، جن سے وہ فعل منسوب ہے۔ ’توفی‘ کا فعل مختلف نسبتوں کے ساتھ مختلف معانی پر محمول ہوتا ہے۔ صاحبِ ”اقرب الموارد“ نے اِس کی چار نمایاں نسبتیں بیان کی ہیں۔ اِس کے ساتھ اگر کوئی امر بہ طورِ مفعول آئے تو اِس کے معنی کسی چیز کو پورا لے لینے کے ہوں گے۔ اگر لفظِ ”مدت“ اِس کا مفعول ہو تو اِس کے معنی مدت کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے ہوں گے۔ اگر اِس کا مفعول ”عدد القوم“ آجائے تو اِس سے مراد لوگوں کو پوری طرح شمار کر لینا ہو گا۔ اگر اِس کا فاعل اللہ ہو

اور مفعول انسان ہو تو اِس کے معنی قبض روح کے ہوں گے۔ یعنی اللہ نے اُس کی روح کو قبض کر لیا ہے اور اُسے موت دے دی ہے۔ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' کے جملے میں 'توفی' کا فاعل 'اِنِّیْ' کی ضمیر متکلم ہے، جو اللہ کے لیے آئی ہے اور مفعول 'كَ' کی ضمیرِ مخاطب ہے، جس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ یعنی 'توفی' کا فعل اللہ سے صادر ہو رہا ہے اور ایک انسان حضرت مسیح علیہ السلام پر منطبق ہو رہا ہے۔ اِس صورت میں اِس کے معنی قطعی طور پر روح قبض کرنے کے ہوں گے، جس کا لازمی نتیجہ موت ہے۔ چنانچہ عربی زبان و بیان کے لحاظ سے یہاں مسیح علیہ السلام کی وفات کے علاوہ کوئی اور مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا۔ قرآن و حدیث کے نظائر بھی شاہد ہیں کہ 'توفی' جب اللہ اور انسان کی نسبت سے آتا ہے تو اِس کے معنی جان قبض کرنے کے ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی، جو زبان و بیان کے اِس قاعدے سے مختلف ہو۔

جہاں تک 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' (میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا) کی ضمیرِ مخاطب سے مسیح علیہ السلام کے زندہ اٹھا لینے کا مفہوم اخذ کرنے کا معاملہ ہے تو یہ زبان و بیان کے خلاف ہے۔ اِس کی تفسیر میں استاذِ گرامی کا موقف یہ ہے کہ نہ 'رفع' کا معنی جملے کی تالیف سے مجرد ہو کر طے کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس مجرد معنی کی روشنی میں قبل و بعد کے اجزا کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ 'رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا' کے دونوں اجزا کے معنی اِن کے معطوف علیہ 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' کی بنا پر طے ہوں گے۔ چنانچہ جب 'توفی' کے معنی قطعی طور پر قبض روح، یعنی وفات کے ہیں تو بعد کے الفاظ سے ایسا مفہوم اخذ کرنے کی گنجایش نہیں ہے، جو وفات کے خلاف یا اُس سے مغائر ہو۔ استاذِ گرامی نے اِسی بنا پر 'رَافِعُكَ' کی ضمیرِ خطاب کا اطلاق عیسیٰ علیہ السلام کے جسد پر کیا ہے، جس میں سے روح کو قبض کر لیا گیا تھا۔ اُن کے نزدیک مسیح علیہ السلام کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اِس وجہ سے کیا گیا کہ آپ کے جسدِ اطہر کو ہر طرح کی دست برد اور اہانت سے محفوظ رکھا جا سکے۔

'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ' کی تفسیر میں غامدی صاحب کا موقف

بیش تر علما و مفسرین کے نزدیک سورۂ نساء (4) کی آیت 159 کے الفاظ 'وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'، میں دونوں مفعولی ضمیروں کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور اِن کا مفہوم یہ ہے کہ "اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اُس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اُس (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان نہ لائے گا اور قیامت کے روز وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اُن پر گواہی دے گا۔" مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر لازماً ایمان لائے گا۔ اِس تاویل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا اثبات کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علما کے نزدیک یہ آیت نزولِ مسیح کی روایات کی موید اور موکد ہے۔ اِن دونوں کے مطالب کو یکجا کیا جائے تو مسیح علیہ السلام کی حیات اور نزول کا تصور برحق ثابت ہوتا ہے۔

جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک سورۂ نساء ہجرت کے بعد اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی، جب مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست قائم ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب پر اتمام حجت اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر کر رہے تھے۔ اِس سورہ کی 176 آیات ہیں، تاہم اِس کا مضمون آیت 126 پر مکمل ہو گیا ہے۔ اِس سے آگے خاتمے تک ایک ضمیمہ ہے، جس میں مخاطبین کے سوالات اور اعتراضات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اِنھی میں اہل کتاب کا وہ مطالبہ شامل ہے، جو آیت 153 میں اِن الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ'، "یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجاے) اِن پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔" اِس مطالبے کا جواب دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انتہائی سخت اسلوب میں پہلے یہود کے بدترین جرائم کی فہرست گنوائی ہے اور اُس کے بعد مطالبے کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: 'وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا'، "اِن اہل کتاب میں سے ہر ایک

اپنی موت سے پہلے لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کرلے گا اور قیامت کے دن یہ (قرآن) اِن پر گواہی دے گا۔" اِس سے واضح ہے کہ غامدی صاحب نے 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ' کی ضمیر کا مرجع قرآنِ مجید کو اور 'قَبْلَ مَوْتِهٖ' کی ضمیر کا مرجع ہر اُس اہل کتاب کو قرار دیا ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا براہِ راست مخاطب تھا۔ اُن کے نزدیک کلام کا موضوع، ترتیبِ بیان، جملوں کا دروبست، آیت کا سیاق وسباق جس واحد تاویل کو قبول کرتا ہے، وہ یہی ہے۔ سیاقِ کلام علما کی تاویل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ تاہم، بر سبیل تنزل اگر اِسے صحیح بھی ماننا چاہیں، تب بھی اِس کے اطلاق اور انطباق کی کوئی شکل متعین نہیں ہو سکتی۔ اِس کے نتیجے میں تعلیق بالمحال کی صورت پیدا ہوتی ہے اور آیت کے مندرجات مطابق حال اور ممکن الوقوع نہیں رہتے۔

ضمیمہ

نزولِ مسیح کے مخالف اہل علم کی آرا

عصر حاضر کے بعض اہل علم نزول مسیح کے قائل نہیں ہیں۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالینے اور اُس کے بعد اُن کو مسلسل زندہ رکھنے کے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اِس ضمن میں وہ متعلقہ قرآنی آیات کی مختلف تاویل کرتے ہیں اور عام تاویلات کو زبان وبیان کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک احادیث کا معاملہ ہے تو وہ اِس موضوع کی روایات کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ اِنھیں لوگوں کی خود ساختہ قرار دیتے ہیں اور بعض خارجی تصورات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

اِس موقف کے نمایندہ علما کی آرا درج ذیل ہیں۔

معروف حنفی عالم مولانا محمود حسن حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک نزولِ مسیح کے تصور کی قرآن مجید میں کوئی واضح بنیاد نہیں ہے۔ جہاں تک نزولِ مسیح کی روایتوں کا تعلق ہے تو وہ اُنھیں یہودی مآخذ پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”... یہ یہودیوں اور صابیہ کی عبارتیں ہیں، جو مسلمانوں میں مشہور ہوئیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد انصار بنی ہاشم جو کہ صابئہ میں سے تھے، کے ذریعہ سے اور

یہودیوں نے مشہور کیا، جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موالی میں سے تھے۔ اُنھوں نے یہ مشہور محبت سے نہیں، بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے بغض کی وجہ سے کیا ہے... پس یہ لوگ اِن روایات کو قبول کرتے ہیں اور اِن سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علوم اسلامیہ کے تمام شعبوں کا مرجع و منبع قرآن عظیم ہے اور اُس میں کوئی آیت ایسی نہیں، جو صراحتاً اِس بات پر دلالت کرے کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے اور یہ کہ وہ زندہ ہیں اور نازل ہوں گے۔ سوائے اخذ کردہ (استنباطات) دلائل کے اور بعض تفسیروں کے۔ اور یہ (یعنی اخذ کردہ دلائل اور تفسیرات) شک و شبہ سے خالی نہیں ہیں۔ اور جو چیز اِس درجہ کی ہو، کیسے ممکن ہے کہ ہم اُس کو عقیدۂ اسلامیہ کی بنیاد بنا ڈالیں؟"

(ترجمہ تفسیر الہام الرحمٰن 49 الجزء الثانی، بہ حوالہ عقیدۂ ختم نبوت اور نزولِ مسیح، قمر عثمانی 53-54)

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی تفسیر "الہام الرحمٰن" میں سورۂ آل عمران (3) کی آیت 55 کے تحت بیان کیا ہے کہ اِس آیت میں 'اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ' کے معنی موت دینے کے ہیں۔ لکھتے ہیں:

قوله: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا.[125] ومعنى متوفيك مميتك. واما ما شاع بين الناس من حياة عيسى عليه السلام فهى اسطورة يهودية وصابئية. وقد شاعت بين المسلمين بعد مقتل

" اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' میں 'اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ' کے معنی یہ ہیں کہ جب میں تم پر موت وارد کر دوں گا۔ رہا عام لوگوں کا یہ تصور کہ حضرت مسیح زندہ ہیں تو یہ ایک یہودی و صابئ تصور ہے،

[125] آل عمران 3:55۔

عثمان رضی اللّٰہ عنه بواسطة انصار بنی هاشم من الصائب، ومن اليهود الموالين لعلى بن ابى طالب لا لحبه بل انما اشاعوها بين المسلمين بغضا فى الاسلام واهله بين من لم يتدبر معنى قوله تعالى: هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ.[126] واتخذها عقيدة ولا يفهم معنى هذه الاية الكريمة الا من يتقن الاجتماعية العامة ويكون ماهرا فيها. وأما من يؤمن بتلك الروايات، ويأتوننا بها فهم ابعد الناس من العلوم الاجتماعية،واذا كانوا جاهلين بمعنى هذه الاية الشريف فانهم يقبلون تلك الروايات ويتاثرون بها. ولا يخفى أن مرجع العلوم الاسلامية باسرها ومنبعها هو القرآن العظيم. وليس فى آية تدل صراحة على أن عيسى

جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایرانیوں اور یہودیوں نے شیعانِ علی رضی اللہ عنہ میں شامل ہو کر مسلمانوں کے درمیان پھیلایا۔ ایرانیوں اور یہودیوں کی یہ حرکت اسلام اور مسلمانوں سے بغض کی بنا پر تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن مجید کی اِس عظیم و جلیل آیت کی طرف اپنی توجہ مبذول کیے رکھیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث ہی اِس لیے کیا ہے کہ وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اِس آیت پر عمل کرتے ہوئے پورے کرۂ ارض پر چھا جائیں اور مجوسی و یہودی اور تمام غیر اسلامی مذاہب فنا کے گھاٹ اتر جائیں۔ اِس لیے اُنھوں نے نزول مسیح کا تصور دیا

[126] الصّف 9:61۔

لم يمت. وانه حى سينزل الا الاستنباطات وتفسيرات من البعض، ولا يخلو ذلك من شكوك وشبهة. وما كان بهذه المثابة كيف يمكن أن تتخذه مبنى عقيدة اسلامية؟
(الہام الرحمٰن 2/ 49–50، بہ حوالہ نزول مسیح، قمر عثمانی 54-55)

کہ تمام دنیا پر اسلام کو غالب کرنے کا کام تو دراصل حضرت مسیح دوبارہ تشریف لاکر کریں گے۔ اِس لیے قسمت کے اِس لکھے کے خلاف آج ہی یہ کام کرنا کہ ساری دنیا پر اسلام کو غالب کر دیں، کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم آیۂ جلیلہ کے مطلب و مقصد کا اندازہ وہی کر سکتا ہے، جو اجتماعیات کا ماہر اور اُس کی گہرائیوں کا جاننے والا ہو، حیات و نزولِ مسیح کا عقیدہ ماننے والے اِس آیت کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اِس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تمام عقائدِ اسلامی کا مرجع و منبع قرآنِ مجید ہے۔ اِس میں نزولِ مسیح کے متعلق کوئی صریح آیت نہیں ہے۔ لوگ اِس سلسلہ میں جو کچھ پیش کرتے ہیں، وہ اُن کے استنباطات اور اُن کی تشریحات و توضیحات ہیں۔ ایسی صورت میں حیات و نزولِ مسیح کو عقیدہ قرار دینا اور اُسے مدارِ کفر و ایمان بنالینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟“

مصر کے مشہور عالم علامہ محمود شلتوت نے نزولِ مسیح کی روایتوں کو مضطرب اور باہم متناقض قرار دیا ہے۔ اُن کا تبصرہ یہ ہے:

”یہ روایاتِ مضطربہ اپنے الفاظ اور معانی میں اِس قدر مختلف ہیں کہ اِن میں تطبیق ممکن نہیں۔ اِس امر کی تصریح خود علماے حدیث نے کی ہے۔ مزید برآں یہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات ہیں، جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے تھے۔ علماے جرح و تعدیل کے نزدیک اِن راویوں کا جو درجہ ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مفسرین کی دوسری دلیل وہ روایت ہے، جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس میں اُنھوں نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح تسلیم کر لی جائے، تب بھی یہ خبر واحد ہے اور علماے امت کا اجماع ہے کہ خبر واحد سے نہ تو کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امورِ غیبیہ کے بارے میں اُس پر اعتماد کرنا درست ہے۔“

(عقیدۂ ختم نبوت اور نزولِ مسیح، قمر عثمانی 13-15)

حدیث کے معروف عالم مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی (1923ء-2005ء)[127] دجال کے خروج اور نزولِ مسیح کی روایات کو بالکلیہ رد کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ روایتیں تصورِ ختم نبوت کے خلاف ہیں۔ مزید یہ کہ اِنھیں فن حدیث کے مسلمہ معیارات کے مطابق مقبول روایتوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تالیف ”احادیث دجال کا تحقیقی مطالعہ“[128] میں موضوع کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[127] مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والے ہندوستان کے محدث اور موطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل کے شارح۔

[128] اِس میں خروجِ دجال اور نزولِ مسیح کی جملہ روایتوں پر روایتاً اور درایتاً نقد کیا گیا ہے اور اُنھیں موضوع (من گھڑت) قرار دیا گیا ہے۔

"تابعین و اتباع تابعین کے زمانہ میں بہت سے روایت پیشہ، افسانہ ساز دجال کذاب راویانِ اخبار و احادیث کا سیلاب امتِ مسلمہ کے عقائد و اعمال کو تباہ کرنے کے لیے امڈ پڑا تھا۔ اِن میں دشمنانِ حق روافض بھی تھے، وہ نو مسلم اہل کتاب بھی تھے، جو منافقانہ مسلمان ہو گئے تھے۔ عوام میں شہرت اور عزت حاصل کرنے کے شیدائی تھے، جو چاہتے تھے کہ اُنھیں امام و علامۂ انام مانا جائے۔ متواتر الثبوت احکام شرع تو اِن راویوں کی دست برد سے بچ گئے۔ قرآنِ کریم میں اُنھوں نے جو لفظی تحریفات کی تھیں، وہ بھی پاؤں نہ چل سکیں، مگر اِن کی معنوی تحریفات بعض محدثین کی بہ دولت خوب رائج ہوئیں۔ اِن شقی القلب راویوں نے امام مہدی، ابن صیاد اور خروجِ دجال و نزولِ مسیح کے متعلق منہ بھر بھر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام پر دروغ بافیاں کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اِس کتاب میں دجال و نزولِ مسیح کے متعلق روایت کی ہوئی ہر حدیث کو روایت و درایت کے مسلمہ اصول و ضوابط کے مطابق جانچا پرکھا گیا ہے تاکہ لوگ اِس غلط خیالی میں نہ پڑیں اور جو پڑے ہوئے ہیں، اِس کے چکر سے نکل آئیں کہ قرب قیامت کی نشانیوں میں سے کانے دجال کا نکلنا ہے، جو ایسا ایسا ہو گا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا، آخر اُسے قتل کرنے کے لیے آسمان سے حضرت عیسیٰ بن مریم اتریں گے۔ اُسے قتل کر کے عدل و انصاف کے ساتھ شریعتِ محمدیہ کے مطابق برسوں فرماں روائی کریں گے، پھر وفات پا کر مدفون ہوں گے۔

یہ سب غلط خیالی ہے، محض بکواس ہے۔ حق یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اللہ کے آخری نبی ہیں، آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نہ اصالۃً، نہ نیابۃً۔"(135)

مولانا ابو الکلام آزاد کے نزدیک نزولِ مسیح کے تصور کو اُسی صورت میں مانا جا سکتا تھا، جب اُس کا ذکر قرآن مجید میں بہ صراحت ہوتا۔ چونکہ قرآنِ مجید میں اِس طرح کی کوئی بات

مذکور نہیں ہے، اِس لیے اِسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”باقی رہا نزولِ مسیح علیہ السلام کا معاملہ، تو یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے اور اگر کسی زمانے میں مسلمانوں کی نجات و سعادت اِس پر موقوف رہنے والی تھی تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اِسے بیان کر دیتا، اُسی طرح صاف صاف، جس طرح اُس نے تمام مہماتِ دینیہ و اعتقادیہ بیان کر دی ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں کوئی تصریح موجود نہیں، پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اِس کے اعتقاد پر مجبور ہوں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اب نہ کوئی بروزی مسیح آنے والا ہے، نہ حقیقی۔ قرآن آ چکا ہے اور دین کامل ہو چکا۔ اگر آپ طالبِ حقیقت ہیں تو اِن جھگڑوں میں نہ پڑیے، نہ اِن خرافات کے بارے میں سوالات کیجیے۔ ہمیں تلاش نجات کی ہے، اگر نجات کے لیے قرآن کامل ہے تو پھر وہ عقائد کافی ہیں، جو قرآن نے بتلا دیے ہیں۔ زیادہ کاوش میں ہم پڑیں ہی کیوں؟“

(شائع شدہ: روزنامہ زمیندار، لاہور، 26/ جون 1936ء)

مولانا آزاد نے ایک خط میں اِسے مسیحی عقیدے سے تعبیر کیا ہے، جو اُن کے نزدیک ہماری کتب میں در آیا ہے:

”تعجب ہے کہ نزولِ مسیح کے بارے میں آپ کی خلش باقی ہے۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی تھی، البتہ وجوہ و دلائل کے لیے کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ بغیر تفصیل کے اِن کا استقصا ممکن نہیں۔ بلاشبہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ عقیدہ اپنی نوعیت میں ہر اعتبار سے ایک مسیحی عقیدہ ہے اور اسلامی شکل ولباس میں نمودار ہوا ہے، لیکن کیوں کر نمودار ہوا؟ یہ بحث طلب ہے۔“

(نقوش آزاد، مرتبہ: غلام رسول مہر، خط 47، ص 99، ناشر: کتاب منزل، لاہور)

علامہ اقبال اِس تصور کو عجمی سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اِس کی روایات کو قبول نہیں کرتے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک مہدی، مسیحیّت اور مجددیّت کے متعلق جو احادیث ہیں، وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے اِن کو کوئی سروکار نہیں۔“ (کلّیات مکاتیب اقبال۔ جلد سوم، جنوری 1929ء تا دسمبر 1934ء- مرتّبہ سیّد مظفرّ حسین برنی۔ ناشر اردو اکادمی دہلی۔ سنہ اشاعت 1993ء)

مشہور دیوبندی عالم مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کے صاحب زادے قمر احمد عثمانی صاحب اپنی کتاب ”عقیدۂ ختم نبوت اور نزولِ مسیح“ میں لکھتے ہیں کہ ختم نبوت اور حیاتِ مسیح کے عقائد ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اُن کے نزدیک بہت سے نام ور علما وفاتِ مسیح کے قائل تھے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

”حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے قائل تھے، اور علماے متقدمین میں امام ابنِ حزم اور امام ابنِ تیمیہ نے نزولِ مسیح کے مسئلہ کو اختلافی مسئلہ قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: ”مراتب الاجماع، لابن حزم اور نقد مراتب الاجماع، لامام ابن تیمیہ) ہمارے زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ تمنا عمادی پھلواروی، علامہ مولانا موسیٰ جاراللہ، شیخ نور محمد مرشد المکی، علامہ شاہ محمد جعفر ندوی، علامہ اقبال، شیخ محمود شلتوت مصری، علامہ سید رشید رضا مصری، اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے نام ور علماے دین اور ارباب علم و دانش نزولِ مسیح اور ظہورِ مہدی کے عقیدوں کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔“ (6-7)

وہ مزید لکھتے ہیں:

”عقیدۂ ختم نبوت کی موجودگی میں حیاتِ مسیح اور نزولِ مسیح کا تصور قلب و ذہن میں ہمیشہ ہی کھٹکتا رہا کہ یہ دونوں تصورات ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اگر عقیدۂ ختم نبوت برحق ہے تو کسی نبی کے آنے اور دین اسلام کو حقیقی غلبہ دلانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔“ (8-9)

’’نزولِ مسیح‘‘ کا تصور اپنی تفصیل کے لحاظ سے چار تصورات کا مجموعہ ہے۔ ’رفعِ مسیح‘، ’حیاتِ مسیح‘، ’نزولِ مسیح‘ اور ’وفاتِ مسیح‘۔ اِن سے مراد یہ ہے کہ جب یہود نے مسیح علیہ السلام کو مصلوب کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو زندہ آسمان کی طرف اٹھا لیا تھا۔ قیامت کے قریب آپ زمین پر نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کرنے کے بعد وفات پا جائیں گے۔ جناب جاوید احمد غامدی مسیح علیہ السلام کے رفع کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ آپ کے زندہ اٹھائے جانے کے تصور کو خلافِ قرآن قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک آپ کے بہ نفسِ نفیس نازل ہونے کا تصور ہے تو اُسے وہ محلِ نظر سمجھتے ہیں۔ اِس کا سبب وہ اشکالات ہیں، جو نزولِ مسیح کی روایتوں کو قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھنے اور تدبرِ حدیث کے اصولوں پر جانچنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم، وہ اِن روایتوں کو قبول کرتے ہیں، مگر اُن کی تاویل حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اُس کے مطابق خود مسیح علیہ السلام نے معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر بتایا تھا کہ وہ قیامت سے پہلے اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔

سید منظور الحسن کی پیدایش 20 اپریل 1965 کو جنوبی پنجاب (پاکستان) کے شہر بہاول نگر میں ہوئی۔ والد سید محمد حسن شاہ تصوف کے سلسلۂ قادریہ کی مقامی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول بہاول نگر سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج بہاول نگر سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے سیاسیات اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم اے اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جی سی یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ عربی و اسلامیات سے ایم فل بھی مکمل کیا۔ ادب، سائنس اور اسلام کی بنیادی تعلیم اپنے شہر کے جید عالم اور عالی مرتبت استاد جناب محمد نذر صاحب سے حاصل کی۔ اُنھی کا فیض تربیت مدرسۂ فراہی کے جلیل القدر عالم اور محقق امام العصر جناب جاوید احمد غامدی کی دانش گاہ تک رسائی کا باعث بنا۔ اُن سے شرفِ تلمذ کا سلسلہ 1991ء سے قائم ہے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں جن اساتذہ سے علوم و فنون کا اکتساب کیا، اُن میں سب سے نمایاں نام اردو اور عربی زبان و ادب کے نابغۂ روزگار ڈاکٹر خورشید رضوی کا ہے۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر سید سلطان شاہ، ڈاکٹر فاروق حیدر، ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، جناب محمد رفیع مفتی اور جناب محمد ظفر عادل سے بھی کسبِ فیض کا موقع ملا۔ ’ادارۂ علم و تحقیق، المورد‘ کے فیلو ہیں اور ’غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ‘ کے مختلف تصنیفی اور تعلیمی منصوبوں میں شریک ہیں۔ ماہنامہ ’’اشراق‘‘ امریکہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

Ghamidi Center of Islamic Learning
www.ghamidi.org
AN INITIATIVE OF AL-MAWRID US